اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ

بے شک یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے

تفسیر مدارک

اردو

تالیف

امام المفسرین عبداللہ بن احمد نسفی حنفی

اردو ترجمانی

مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری استاذ دارالعلوم دیوبند

ابن امام العصر حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری

ناشر: خضر راہ بک ڈپو، دیوبند یو۔پی

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ

تفسیر

مدارک اردو

شائع کردہ

خضر راہ بکڈپو، دیوبند۔ یوپی

پارہ اوّل کا جزء اوّل

(محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

انتساب

یہ حقیر خدمت اُس بارگاہ کبریائی میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں جس نے قرآن مجید کو سرچشمۂ ہدایت بنا کر، اپنے مقبول پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، اے اللہ ایک ظلوم وجہول کی ان بے مایہ کوششوں کو قبولیت کے شرف سے نوازنا آپ ہی جیسے رؤف ورحیم کا کام ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

ایک سوال، ایسا اہم سوال جس کے جواب سے آپ صرف نظر نہیں کر سکتے، پوری کائنات، انسان سے برابر کر رہی ہے سوال یہ ہے کہ انسان کو بطن مادر کی تاریک ترین کوٹھری میں غذا بہم پہنچائی، پیدا ہوا تو ماں کے جسم کے ایک حصّہ سے لطیف غذا کا اہتمام، ماں باپ کے قلب میں محبت و شفقت کا بھرپور جذبہ، زندگی کے تدریجی مراحل کے ساتھ، انعامات و افضال کی خوشخرام پیہم عنائیت، کھانے کے لئے غلّہ، غلّوں کے سرسبز و شاداب کھیت، جھلستی ہوئی کھیتوں کے لئے پانی، نسیم سحر کے خنک جھونکے، پینے کے لئے، دریا، تالاب، ندیاں، نالے، پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیاں، شیریں، لطیف، خوش ذائقہ اور خوشرنگ میووں کے انبار، گھر بار، پوشاک، لباس، دولت و دھن، دین دنیا، اولاد وغیرہ۔ قدم قدم پر نعمتیں، ہر ہر سانس پر فضل و انعام، پوچھنا یہ ہے، کہ کائنات کے خالق کے یہ مسلسل انعامات کیا انسان کا کوئی حق ہے جس کو وہ چار و ناچار ادا کرے گا، حسن عمل کا کوئی نتیجہ ہے جس کو دینا خدا تعالےٰ کے لئے ضروری ہے۔ یہی سوال ہے جس کا جواب مختصر، سوال کے طول و عرض سے بہت کم، صرف یہ کہ منعم حقیقی کے یہ انعامات، یہ فضل، یہ کرم، یہ عنایت یہ سب کچھ کسی استحقاق کے بغیر انسان پر جاری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض زندگیاں، ذرا خفی طرح پر اپنے غیر مستحق ہونے ہونے کا ثبوت دیتی ہیں، اور کچھ سراپا جلی طور پر بلا استحقاق نعمتوں کا مورد نظر آتے ہیں۔

یہ خاکسار مترجم، ان ہی انسانوں سے ہے، جن پر لاتعداد، غیر محدود، بے شمار، ان گنت اللہ تعالیٰ کے افضال اور کسی بھی استحقاق کے بغیر، اتنے واضح طور پر کہ ہر ایک کو نظر آئیں، دکھائی دیں۔ دارالعلوم دیوبند کی خدمت تدریس بارہ سال سے مسلسل، قرآن مجید کی تفسیر و تشریح کی سعادت، تفسیر ابن کثیر کا ترجمہ، تفسیر حقانی پر اضافات اور اب ایک مکمل تفسیر مدارک کے ترجمہ کی نورانی خدمت، اس پیروزہ بختی پر، شکریہ کی زبان کہاں سے لاؤں، الفاظ کی محدود ترجمانی، خوش کامیوں کی اس داستان کو کس طرح سمیٹے۔ مختصر یہ کہ کفران نعمت، ایک عذاب ہے۔ بارالہا! اپنی غیر محدود نعمتوں کے ساتھ، ہر ہر نعمت پر، ہر بن مو کو زبان شکر، بننے کی توفیق آپ ہی عطا فرمائیں گے۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

تفسیر مدارک کی خصوصیات

غالباً بارہ سال قبل، تفسیر مدارک، ترجمہ قرآن کے ذیل میں نظر سے گزری اس کے جامع اختصار، ٹھوس مضامین، اور پیرایہ بیان کی جاذبیت و کشش نے متاثر کیا، مسلسل مطالعہ جاری رہا یہاں تک کہ پوری تفسیر کے ہزاروں صفحات پڑھ ڈالے، بعد میں الحمدللہ مختصر، طویل چھوٹی، بڑی، جدید اور قدیم، ہر ہی رنگ کی تفاسیر نظر سے گزرتی رہیں، لیکن "مدارک" کا نقش دل پر گہرا ہوتا چلا گیا، اور اس تفسیر کی اہم خصوصیات نے آج بارہ سال کے بعد، اردو ترجمہ کی شکل میں پارہ اول کے جزاول کا ترجمہ ناظرین کے سامنے پیش کرنے کا بہترین اور مبارک موقع دیا، چند خصوصیات آپ بھی سن لیجئے تاکہ مطالعہ کے وقت کتاب

کی اہمیت، مضامین کے دلنشیں کرنے میں معین و مددگار رہو۔

صدیوں سے ہمارا سرمایہ حدیث و تفسیر گروہی عصبیت کا تختہ مشق ہے، یعنی تفاسیر و احادیث کے مجموعے شافعی المذہب علماء کے قلم سے تیار ہوتے رہے، گو کوئی بری بات نہیں، علم کی خدمت جس حلقہ سے بھی ہو خوش آیند ہے، جس جماعت کی جانب سے ہو قابل پذیرائی ہے، مگر افسوس "علم" جیسے لازوال، ابدیت نشان، سب کی دولت، سب کے سرمایہ کو، ہر عصبیت سے پاک ہونا چاہیئے تھا لیکن بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا، اور اپنے مسلک کی ترجمان، تفسیر و حدیث کی طول و طویل کتابیں بھی بن گئیں، بہرحال جو کچھ ہو چکا تھا اس کا تدارک اس کے سوا اور کیا ہے کہ خاص حنفی، نقطۂ نظر" سے بھی قرآن مجید کی تفسیر ہو۔ مطلب یہ نہیں کہ قرآن حکیم کو "حنفیت" کے خراد پر اتارا جائے۔ بلکہ ان مواقع و محل کی نشاندہی کی جائے جو حنفیت کے ابلتے ہوئے چشمے اور رستی ہوئی سوتیں ہیں "حنفیت" کی آئینہ دار ہونے کی حیثیت سے مختصر تفسیر "مدارک" متوسط تفسیر مظہری، اور طول و طویل، "روح المعانی" ہے۔ مترجم نے تفسیر مدارک کے ترجمہ میں اہم ترین ضرورت حنفیت کی صحیح ترجمانی بھی سامنے رکھی۔ یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ اس ترجمہ کا اہم ترین محرک، مدارک کی ... یہی خصوصیت ہے

(۲) گمراہ پسند جماعتوں کے خیالات، غلط فکر، کی نہ صرف نشاندہی، بلکہ انکا مکمل رد آپ کو اس تفسیر میں ملجائے گا، اور شاید اس باب میں "مدارک" بے نظیر تفسیر ہے، جس میں ہر گمراہ فرقہ کی پوری تردید مل جاتی ہے۔

(۳) ہر طرح کی ان لغو روایات اور مہمل مضامین سے یہ تفسیر خالی ہے، جو ہماری بعض معرکۃ الآراء تفاسیر کا بھی جز غالب ہیں اسرائیلیات، موضوع روایتیں، تقریباً، قدیم تفسیری ذخیرے میں ہر ہر جگہ موجود ہے، صاحب مدارک نے بڑا کام کیا کہ اپنی تفسیر کو مہمل اور بے سر و پا قصوں سے خالی رکھا، بلکہ جہاں کہیں کوئی ایسی روایت زیر بحث بھی آگئی، تو یا تردید کیلئے یا پھر تذکرہ کے طور پر ایسا کہیں نہیں ہوا کہ اسی بے بنیاد روایت کو آیت ربانی کا صحیح حل بنا کر پیش کیا ہو۔

(۴) قرآن مجید کے پیغام کو ایک ایسے اچھوتے اسلوب اور دل نشیں پیرایہ میں ذکر کیا ہے، جس سے قرآن مجید کی عظمت معنویت، شوکت الفاظ، ترکیب کا دروبست، دلائل کی معرکہ آرائی، مضامین کی رفعت، اثر انگیزی، تاثیر کے اجاگر پہلو، سرد نہیں ہوئے بلکہ، چمک گئے۔

یہ بڑا کمال ہے جسکو محض لطیفہ قدرت کہئے کہ "صاحب مدارک" کے قلم نے محفوظ کر لیا۔

(۵) تفسیر ہو یا تراجم قرآن، دل کی دنیا جب تک مرکز انوار الٰہی نہ ہو، علمی کارنامے تو ہو سکتے ہیں لیکن مقبول بارگاہ کبریائی "خدمت" ہرگز نہیں ہو سکتی، آپ سنیں گے اور سنکر محظوظ ہوں گے کہ علامہ ابو البرکات عبداللہ ابن احمد النسفی مصنف، "مدارک" طبقہ، صوفیاء کی ایک جانی پہچانی شخصیت بڑے روشن ضمیر اللسان تھے، خدا تعالیٰ کے یہاں اس مقبول تفسیر کی مقبولیت، ہزاروں صوفیاء اولیاء کے یہاں، "مقبولیت" کی صورت میں جلوہ افروز ہوئی، چنانچہ صدیوں ہندوستان کی خانقاہیں تفسیر مدارک کے درس و تدریس سے مترنم رہیں۔

(۶) خاکسار مترجم نے، فٹ نوٹس میں ان تمام مقامات کی مکمل تشریح بھی کر دی جن کی تفسیر میں اختصار سے کام لے کر صاحب مدارک نے مختصر کلام کیا تھا، یا جہاں کوئی ضعیف قول پیش کیا گیا اور صحیح و درست آراء سامنے نہ آسکیں، ان حواشی میں، متعدد مشہور تفاسیر کے حوالے جابجا آپ کو ملیں گے۔

(۷) تفسیر مدارک نے، قرآن مجید کی آیات سے حاصل فقہی جزئیات و احکام کا زیادہ اہتمام نہیں کیا، مترجم نے حواشی میں احکام القرآن للجصاص اور لابن عربی سے موقع بموقع اس طرح کے احکام کی تعیین و نشاندہی کی ہے

(۸) ترجمہ میں لفظی پابندی کو چھوڑ کر مفسر کے مفہوم کو ادا کرنے کی زیادہ کوشش کی ہے تاکہ ترجمہ سے زیادہ یہ

ایک مستقل" اردو تفسیر" نظر آئے اور معانی و مطالب کے سمجھنے میں الجھاؤ نہ ہو۔

آئندہ کا پروگرام ایک خاص بات ترجمہ میں رہ گئی۔ آئندہ انشاءاللہ اس کا خاص طور پر اہتمام رہے گا وہ یہ کہ ہر رکوع کے بعد اس رکوع کا حاصل یا بالفاظ دیگر "قرآن کا پیغام" لکھا جائے گا تاکہ معلوم ہو کہ قرآن آپ سے کیا کہہ رہا ہے، ان چند جزوی باتوں کے علاوہ آپ کے مفید مشوروں کا انتظار ہے۔

اعتذار خیال تھا کہ ترجمہ سے قبل ایک مختصر مقدمہ ان تمام مضامین پر حاوی پیش کیا جائے جو قرآن فہمی کے لئے بہت ضروری ہیں، لیکن مقدمہ کی ضخامت دیکھکر ایک مستقل رسالہ کی شکل میں اس کو پیش کرنا ہی مناسب معلوم ہوا۔ انشاءاللہ ایک ایسا مقدمہ جو فہم قرآن کی بنیاد ہو۔ جلد ہی ناظرین کے سامنے آئے گا۔

بڑی شرم و ندامت ہے کہ حسب وعدہ ذی الحجہ کے مہینے میں پارہ پیش نہ کیا جا سکا۔ ناتجربہ کاری تھی کہ ایسی مدت کا اعلان کیا جس میں ادارہ کے لئے" ترجمہ پیش کرنا بس سے باہر تھا۔ کام کے پھیلاؤ سے معلوم ہوا کہ کم از کم ایک پارہ کے بعد دوسرے پارہ کا درمیانی وقفہ دو ماہ سے ہرگز کم نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے دوسرے جزو کا انتظار اب سے دو ماہ بعد فرمائیں۔

نقش اول کی خامیاں، قلب ان کے احساس سے فارغ نہیں۔ انشاءاللہ نقش ثانی ہر خامی سے پاک نظر آئے گا۔

انظر شاہ کشمیری
استاذ دارالعلوم دیوبند
۸ر صفر ۱۳۸۳ھ دیوبند

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ① الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② مٰلِكِ يَوْمِ

سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے ف۱ جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں جو مالک ہیں روزِ

الدِّيْنِ ③ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ

جزا کے ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں ف۲ بتلا دیجئے ہم کو رستہ

الْمُسْتَقِيْمَ ⑤ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ

سیدھا رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے ف۳ نہ رستہ

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦ ع

ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو رستہ سے گم ہو گئے

ع ۱

فاتحۃ الکتاب سورۂ فاتحہ کے متعلق بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نزول مکہ معظمہ میں ہوا اور یہ بھی مشہور ہے کہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ اس کا نزول مکہ اور مدینہ زاد اللہ شرفاً دونوں جگہ ہوا۔ مکہ معظمہ میں اس وقت جب کہ نماز فرض کی گئی تھی اور مدینہ میں تحویل قبلہ (بیت المقدس سے خانہ کعبہ کی جانب نماز میں رُخ کیا گیا) کے وقت یہ سورۃ نازل ہوئی۔

سورۂ فاتحہ کے متعدد نام ہیں جن میں سے ایک نام "ام القرآن" بھی ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اس شخص

کی نماز نماز ہی نہیں جس نے "ام القرآن" نہیں پڑھی۔ اس حدیث میں ام القرآن سے سورۃ فاتحہ ہی مراد ہے۔ نیز تمام ہی علوم قرآن پر حاوی ہونے کی وجہ سے بھی اس کو "ام القرآن" کہتے ہیں۔ سورہ وافیہ اور سورۃ کافیہ بھی اس کے اسماء ہیں۔ سورہ کنز بھی اسی کا نام ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ سورۃ فاتحہ میرے عرش کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ اسی طرح سورۃ شفا اور سورۃ شافیہ بھی اسی کے نام ہیں۔ مشہور حدیث ہے کہ سورۃ فاتحہ موت کے علاوہ تمام بیماریوں کے لئے نسخۂ شفا ہے[عہ]۔ سورۃ المثانی بھی اسی کو کہتے ہیں کیونکہ تمام نمازوں میں اس کا اعادہ ہوتا ہے۔

ایک روایت میں اس کا نام سورۃ صلوٰۃ بھی آتا ہے، کیونکہ نماز میں اس کی تلاوت فرض ہے یا واجب[عہ]، سورۃ حمد اور سورۃ اساس بھی اس کے نام ہیں، کیونکہ قرآن کے تمام مضامین کا عمود اور بنیاد یہی سورت ہے۔ ابن عباس کے ایک اثر میں سورۃ فاتحہ کے لئے اساس کا لفظ آیا ہے۔ چنانچہ آپؓ نے فرمایا کہ جب تم بیمار ہو یا تم کو کوئی شکایت ہو، تو سورۃ اساس سے کام لو۔ آیات بالاتفاق سورۃ فاتحہ کی سات ہیں۔

کیا تسمیہ سورۃ فاتحہ کا جزء ہے؟

مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کا فیصلہ ہے کہ تسمیہ سورۃ فاتحہ کی آیت نہیں ہے بلکہ باقی تمام قرآنی سورتوں سے بھی تسمیہ کا تعلق جزء کا نہیں ہے تسمیہ سورتوں کی ابتداء میں صرف تبرک اور ایک سورت کو دوسری سورت سے جدا و ممتاز کرنے کے لئے لکھی جاتی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے ہے، بلکہ تمام احناف یہی کہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے خیال میں نماز میں تسمیہ کو بلند آواز سے پڑھنا جائز نہیں۔

لیکن مکہ اور کوفہ کے قراء کی رائے ہیں بسم اللہ، سورۃ فاتحہ کا جزء ہے بلکہ قرآنی سورتوں سے بھی اس کا تعلق جزء ہی کا ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے مسلک پر عمل کرنے والوں کی رائے بھی یہی ہے اور اسی لئے شوافع کے خیال میں تسمیہ نماز میں بلند آواز سے پڑھنا ضروری ہے۔ ان لوگوں کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ تسمیہ قرآن مجید میں ہمیشہ سے لکھی جاتی رہی، حالانکہ قرآن سے خارج چیز کو قرآن میں داخل نہ کرنے کا اہتمام سب ہی کو معلوم ہے اس لئے کہنا پڑے گا کہ اگر بسم اللہ الخ قرآن کی آیت نہ ہوتی تو کبھی بھی اسکو قرآن میں لکھا نہ جاتا۔ شوافع نے ایک اثر بھی ابن عباس کا نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جس نے تسمیہ کو چھوڑ دیا تو گویا کہ اس نے قرآن کی ایک سو چودہ ۱۱۴ آیات کو چھوڑ دیا۔

احناف نے تسمیہ کے جزء فاتحہ نہ ہونے پر جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں سے ایک ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ مشہور حدیث ہے۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "سورۃ فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نصف نصف تقسیم ہو گئی۔ اب میرا بندہ جو کچھ مجھ سے مانگے گا اس کو دیا جائے گا۔ جب بندہ سورۃ فاتحہ پڑھتا ہوا کہتا ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے میری تعریف کی اور جب "اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ بندے نے میری ثناء بیان کی اور جب "مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ" پر پہونچتا ہے تو فرماتے ہیں کہ بندے نے میری عظمت کا اعتراف کیا اور جب "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" کے الفاظ نکلتے ہیں تو ادھر سے ارشاد ہوتا ہے کہ یہ میرے اور بندے کے درمیان ہے، اور میرا بندہ جو کچھ مجھ سے طلب کرے گا اس کو دیا جائے گا اور جب آخری آیات پر پہونچتا ہے یعنی "اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ" تو خدا تعالیٰ کا بھی آخری ارشاد یہ ہوتا ہے کہ یہ بندہ کو دیا گیا اور جو اس نے مجھ سے مانگا وہ میں نے اس کو دیا۔

اب اس طویل حدیث کی ابتداء میں بسم اللہ کا ذکر تک نہیں آیا اگر سورۃ فاتحہ کا تسمیہ جزء تھا تو یقیناً اس حدیث میں

عہ ظاہر ہے کہ موت کا علاج تو کوئی بھی نہیں ورنہ باقی تمام بیماریوں میں سورۃ فاتحہ کا استعمال جسکے طریقے معتبر عملیاتی کتابوں سے معلوم کئے جاسکتے ہیں مفید ہی

عہ یہ فقہی مکاتب فکر کے اختلاف کیجانب اشارہ ہے کہ بعض ائمہ اس کی تلاوت نماز میں فرض قرار دیتے ہیں اور بعض واجب۔ تفصیل آگے آتی ہے ۱۲

اس کا ذکر ہونا چاہئے تھا اور جب سورۃ فاتحہ ہی کا جز نہیں تو باقی سورتوں کا بھی جز نہ ہوگا۔ یہ حدیث نہایت صحیح ہے اور مصابیح میں موجود ہے اور وہ دلائل جو سیدنا شافعی الامام نے پیش کئے ظاہر ہے کہ وہ ہمارے خلاف نہیں جاتے، کیونکہ ہم تسمیہ کے جز فاتحہ ہونے کا انکار کرتے ہیں یہ تو ہرگز نہیں کہتے کہ تسمیہ قرآن مجید کی آیت نہیں ہے، بلکہ فخر الاسلام نے تو تصریح کی ہے کہ بسم اللہ آخر قرآن مجید کی ایک آیت ہے جو سورتوں میں امتیاز اور فصل کے لئے نازل ہوئی ہے۔ بہرحال احناف کے مسلک پر اعتراض جب ہو سکتا تھا کہ وہ تسمیہ کو آیت قرآن بھی کہنے سے انکار کریں، حالانکہ یہ ان کا خیال نہیں۔ وافی نامی کتاب میں تسمیہ سے متعلق مباحث ملتے ہیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو باء ہے یہ ایک محذوف کے متعلق ہے اصل عبارت یوں ہے کہ بسم اللہ اقرء او اتلو، یعنی اللہ کے نام کے ساتھ پڑھتا ہوں یا تلاوت کر رہا ہوں۔ یاد رکھنے کی بات ہے کہ بسم اللہ کے مناسب فعل کی تقدیر ہوگی۔ مثلاً ایک مسافر سفر ختم کرکے آیا تو وہ کہے گا کہ وطن میں داخلہ خدا ہی کے نام سے ہے ایک سفر کا ارادہ کر رہا ہے اس کو کہنا چاہئے کہ یہ سفر اللہ ہی کے نام سے   ایک شخص جانور ذبح کرتے ہوئے کہتا ہے بسم اللہ کا مطلب یہ کہ اس جانور کو خدا ہی کے نام پر ذبح کرتا ہوں۔ بہرحال اس کی رعایت کرنا ہوگی کہ جس کام کے شروع میں آپ بسم اللہ کہتے ہیں، مقدر فعل اسی کے مناسب ہونا چاہئے۔ یاد ہوگا کہ ہم نے ابھی کہا تھا کہ فعل جس سے بسم اللہ کی باء کو متعلق کرنا ہے وہ بعد میں مقدر ہونا چاہئے۔ بظاہر یہ سوال یہاں ہو سکتا ہے کہ تقدیر فعل بعد میں کیوں رکھی۔ ابتداء میں کیوں نہ مقدر مان لیا گیا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اس موقع پر دو چیزیں ہیں، ایک تو فعل ہے اور ایک وہ چیز جس کے ساتھ تعلق کرنا ہے یعنی (متعلق بہ) ان دونوں میں اہم "متعلق بہ" ہے فعل اہم نہیں۔ اور یہ بھی ہے کہ مشرکین کی عادت تھی جب کوئی کام کرتے تو اپنے بتوں کا نام لیکر کرتے۔ مثلاً کہتے باسم اللات باسم العزیٰ یعنی لات اور عزیٰ کے نام سے شروع کر رہا ہوں تو اب ایک مومن کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ کسی کام کو شروع خدا تعالیٰ کے نام ہی سے کرے تاکہ اس کی طرف سے توحید پسندی کا مظاہرہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد اس طرح جبھی پورا ہو سکتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ کا نام شروع میں آئے۔ اور اصل فعل کو موخر کر دیا جائے۔

یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ "اقرء باسم ربک" میں فعل (اقراء) خدا تعالیٰ کے نام سے پہلے کیوں آگیا۔ جواب یہ ہے کہ بعض علماء کی رائے کے مطابق سورۃ اقرء پہلی سورت ہے جو آپؐ پر نازل ہوئی اور ابتداء میں قرارت کا حکم نہایت اہم اور ضروری تھا اس کی اہمیت کے پیش نظر خدا تعالیٰ کے ذکر پر فعل کو مقدر کر دیا۔

اور ہو سکتا ہے کہ اس اقراء کو مقدر نہ لیں کہ خدا تعالیٰ کے نام کو اس کا مفعول بنانا پڑے اور پھر یہ اشکال ہو کہ فعل خدا کے نام پر کیوں مقدر ہو گیا بلکہ ہم اس فعل کو لازم کہتے ہیں یعنی اقراء معنی میں افعل القراءۃ کے ہے یعنی قرارت کا فعل کرو۔ اور افعال میں اس طرح کے تصرف کی عربی میں نظائر بھی ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں یعطی ویمنع یعنی فلاں یفعل الاعطا یا فلاں یفعل المنع کے معنے میں ہے جن کا حاصل صرف فاعل کی نشاندھی ہے، کس کو دیا جاتا ہے کس کو منع کیا جاتا ہے یعنی مفعول پر نظر ہی نہیں ہوتی۔ اور یہ باسم ربک مفعول اس ابتدائی اقراء کا نہ ہو بلکہ اس اقراء کا ہو جو بعد میں مقدر مانا جائے اور اللہ کا تعلق فعل قرارت کے ساتھ ایسا ہو جائے جیسا کہ "تنبت بالدھن" میں دہن کا تعلق انبات کے ساتھ ہے۔ معنے یہ ہوں گے کہ خدا کے نام ہی کی برکت سے پڑھتا ہوں۔ بہرحال اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے نام کے ساتھ برکت کس طرح حاصل کرنا چاہئے اور یہ کہ خدا تعالیٰ کس عظمت کا مستحق ہے۔ بسم اللہ کی باء مبنی بر سکون ہے کیونکہ باء حرفیت کو لازم ہے اور ساتھ ہی جر کو بھی لازم ہے۔ لہذا اس کی حرکت جو اس کے عمل کے مشابہ ہے اس کی رعایت سے اس باء کو مکسور کر دیا گیا۔

اور اسم ان اسماء میں سے ہے جن کی ابتداء مبنی بر سکون ہے جیسا کہ ابن، ابنیت وغیرہ سکون ہی پر بنی ہیں ایسے اسماء

جن کی ابتداء ساکن ہو تو ان کے شروع میں ہمزہ لے آتے ہیں تاکہ ابتداء بالساکن کی دشواری ختم ہو جائے، لیکن یہی اسماء اگر درمیان کلام میں آجائیں تو پھر ہمزہ وغیرہ کے اضافہ کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ دشواری تو ابتداء میں تھی، درمیان کلام میں کیا دشواری ہے کہ خواہ مخواہ کسی چیز کا اضافہ کیا جائے اور بعض علماء ابتداء میں بھی ہمزہ زائد نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ دوسرا کہ سبب حرکت دیدی گئی تو اب کسی اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور یہ لفظ "اسم" اسمائے محذوفۃ الاعجاز میں سے ہے جن کے آخر سے حرف حذف کر دیا جاتا ہے جیساکہ "ید" اور "ام" وغیرہ۔ اسم کا ماخذ اور مادہ "سمو" ہے کیونکہ اس سے جب مزید صیغوں کی تخریج کی جاتی ہے تو مادہ "سمو" ہی نکلتا ہے "سمو" کے معنے رفعت اور بلندی کے ہیں۔ رسم الخط میں یہاں "الف" حذف کر دی گئی حالانکہ "اقرء باسم ربك" میں "الف" بدستور موجود ہے۔ الف کو حذف کرنے کے بعد "با" کو ذرا طویل کر دیتے ہیں تو یہ طریقہ الف کا مؤخر ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے مکاتب کو بسم اللہ لکھنے کے وقت میں "با" کو طویل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

لفظ "اللہ" اصل میں "الالٰہ" تھا جیساکہ "الناس" اصل الاناس تھا۔ ہمزہ حذف کر دیا گیا اور اس کے عوض میں حرف تعریف سے کام لیا گیا، یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ لفظ الٰہ اسم جنس ہے۔ ہر سچے اور چھوٹے معبود کے لئے اس کو استعمال کیا جاسکتا ہے، لیکن اب معبود برحق ہی کے لئے اس کو بولتے ہیں جیساکہ "النجم" تمام ستاروں کے لئے استعمال ہو سکتا تھا مگر بعد میں "ثریا" کیلئے مخصوص کر لیا گیا، لیکن لفظ "اللہ" صرف معبود برحق ہی کے لئے استعمال ہو سکے گا کسی جھوٹے خدا کے لئے ہرگز استعمال نہیں ہو سکتا۔ نیز یہ لفظ الٰہ اسم غیر صفت ہے مطلب یہ ہے کہ اس کو موصوف بنا کر اس کے لئے کوئی صفت ذکر کریں گے یہ نہیں کہ اس کو صفت کے طور پر استعمال کر لیں مثلاً آپ "شئ اللہ" نہیں کہہ سکتے جیساکہ "شئ رجل" کہنا ٹھیک نہیں، لیکن یہ کہنا بالکل مناسب ہے کہ اللہ صمد، اللہ واحد وغیرہ۔ یاد رکھنا چاہئے کہ خدا تعالیٰ کی صفات کے لئے مناسب موصوف کی ضرورت ہے۔ اب اگر تمام کو صفات کر دیا گیا تو صفات کسی اسم موصوف کے ساتھ استعمال نہیں ہو سکیں گی۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ خلیل، زجاج، محمد بن حسن، حسن ابن الفضل کے خیال کے مطابق لفظ "اللہ" کا کوئی ماخذ نہیں۔

اور بعض علماء کہتے ہیں کہ اشتقاق کا مطلب یہ ہے کہ کم از کم دو یا دو سے زیادہ الفاظ ایک معنی میں مشترک ہوں اگر اشتقاق کی یہ تعریف صحیح سمجھی جائے تو اللہ یقیناً مشتق ہے کیونکہ اللہ اور آلہ کے معنے متحیر ہونے کے ہیں اور اللہ کو اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی حقیقت و کنہہ کے ادراک سے تمام عقلیں قاصر و عاجز ہیں یہی وجہ ہے کہ گمراہی پھیلی ہوئی ہے اور حق کسی خوش قسمت ہی کو معلوم ہو سکا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ الٰہ یاٰلہ سے مشتق ہے جس کے معنے عبادت کرنے کے آتے ہیں۔ اللہ کو اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی عبادت کی جاتی ہے اس صورت میں یہ مصدر اسم مفعول کے معنے میں ہوگا جیساکہ خلق مصدر، مخلوق کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔

رحمٰن فعلان کے وزن پر رحمت سے مشتق ہے جیساکہ غضبان، غضب سے مشتق ہے۔ رحمٰن وہ ہے جس کی رحمت سب کے لئے ہو جیساکہ غضبان انتہائی غضبناک آدمی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ رحیم مریض کی طرح صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ رحمٰن میں رحیم کی بہ نسبت رحمت زیادہ ہے۔ عربی کا مشہور قاعدہ ہے کہ الفاظ کے اضافے معنے کی زیادتی کی علامت ہوتے ہیں۔ قاعدہ کے مطابق رحمٰن میں بمقابلہ رحیم کے ایک لفظ زیادہ ہے۔ رحیم میں کل چار حرف ہیں اور رحمٰن میں پانچ اسلئے رحمٰن میں رحمت کا وفور اور کثرت رحیم کے مقابلہ میں ہوگی۔ دنیا میں خدا کی رحمتیں کافر و مومن سب ہی پر ہیں اسی لئے رحمٰن الدنیا کہا جاتا ہے اور آخرت میں رحمتوں کے مستحق صرف مومن ہی رہ جائیں گے تو صرف رحیم الآخرۃ کہا جائے گا۔ آخرت میں رحمتوں کا دائرہ وسیع نہ ہوگا بلکہ سمٹ کر صرف مومنین میں محدود ہو جائے گا۔

بعض علماء رحمٰن اور رحیم میں ایک اور فرق بھی کرتے ہیں وہ یہ کہ رحمٰن صرف خدا ہی کو کہا جاسکتا ہے خدا کے علاوہ اور

کسی کے لئے استعمال نہیں ہو سکتا۔ بخلاف رحیم کے کہ اس کا غیر پر بھی اطلاق کیا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بسم اللہ میں رحمٰن کو مقدم کر دیا اور رحیم کو مؤخر، حالانکہ قاعدے کے مطابق "پہلے ادنیٰ" درجہ کی چیزیں ذکر کرتے ہیں اور پھر اعلیٰ کا ذکر آتا ہے تو رحیم پہلے مذکور ہوتا اور رحمٰن کا ذکر بعد میں آتا۔ عرب کے ایک شاعر نے اپنے ممدوح کی تعریف میں کہا ہے کہ ع انت غیث الوریٰ لا زلت رحمانا ـــــ اس مصرع میں اس نے رحمان کا لفظ ممدوح کے لئے استعمال کیا اس کو کفر و جہل پر مبنی سمجھئے، اس سے یہ استدلال ہرگز صحیح نہیں کہ رحمان غیر خدا کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کیا رحمان غیر منصرف ہے یا منصرف یہ ایک علمی بحث ہے۔ دو فریق ہیں اپنے اپنے خیال کے مطابق منصرف اور غیر منصرف کہتے ہیں واللہ اعلم بالصواب۔

الحمد للہ کہ بسم اللہ کی تشریح ختم ہوئی اب سورۂ فاتحہ کی تفسیر شروع ہوتی ہے۔

فاتحۃ الکتاب

کسی کے پسندیدہ اوصاف کو اس طرح بیان کرنا کہ دوسروں پر اس کی فوقیت ظاہر ہو اسی کو عربی میں حمد کہتے ہیں۔ نحوی ترکیب کے اعتبار سے الحمد مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع ہے اگرچہ اس پر نصب آنا چاہئے تھا اور بعض علماء کی یہ بھی رائے ہے کہ حمد ان منصوب مصادر میں سے ہے جو مقدر افعال کی وجہ سے منصوب ہوتے ہیں اور معنوی طور پر خبر کے حکم میں استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ شکراً و کفراً وغیرہ۔ یہاں یہ نکتہ خاص طور پر ملحوظ رہے کہ بجائے نصب کے رفع جو الحمد پر لایا گیا مقصود اس کا یہ ہے کہ استمرار و دوام پر دلالت ہو کیونکہ رفع کسی چیز کے ثبوت و استمرار پر دلالت کرتا ہے تو گویا کہ خدا تعالیٰ کی حمد ایک دائمی فریضہ ہے۔ یہ نہیں کہ عمر میں ایک دو بار کرنے سے یہ فریضہ ہمیشہ کے لئے ادا ہو جائے الحمد مبتدا کی خبر دوسرا لفظ یعنی "للہ" ہے۔ اس "للہ" میں جو لام ہے وہ ایک محذوف یعنی ثابت اور واجب کے متعلق ہے علماء کی رائے میں حمد اور مدح مترادف ہیں جن کا مطلب اوصاف پسندیدہ اور عمدہ خصائل پر تعریف کرنا ہے خواہ جس شخص کی آپ تعریف کر رہے ہیں اس سے آپ کو کوئی نفع پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں نے میرے ساتھ اچھا معاملہ کیا اس لئے اس کی تعریف کرتا ہوں یا میں نے فلاں کی غیر معمولی شجاعت پر تعریف کی یا اس کے اعلیٰ حسب نسب کی تعریف کی گئی تو پہلے جملہ میں انعامات پر تعریف ہے اور دوسرے دو جملوں میں صرف اوصاف کی تعریف ہے، حالانکہ شجاع شخص سے اور اسی طرح عالی نسب والے سے تعریف کرنے والے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اس لئے معلوم ہوا کہ حمد کے لئے انعام و اکرام ہونا غیر ضروری ہے۔

ہاں شکر اس وقت ہوتا ہے جب آپ کے ساتھ کسی نے نیک معاملہ کیا ہو خواہ آپ اپنی ممنونیت کا اظہار زبان سے کریں یا دل ہی دل میں احساس موجود ہو یا پھر اپنے جسم سے محسن کی خدمت میں لگ جائیں یہ سب صورتیں شکر گذاری ہی کے مظاہرے کہلائیں گی اور حمد صرف زبان سے ہو سکے گی حمد کا ذریعہ اظہار زبان کے علاوہ کوئی اور نہیں عرب کے کسی شاعر نے شکر کے ان تینوں طریقوں کو اپنے شعر میں ذکر کیا ہے شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ اے ممدوح تمھاری نعمتوں نے مجھ سے تین طرح اپنا شکریہ وصول کیا، ایک زبان سے دوسرے اعضاء اور تیسرے اس عضو سے جو جسم میں پوشیدہ ہے جس کو دل کہتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ حمد، شکر ہی کی ایک شاخ ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ حمد، شکر کی اصل و بنیاد ہے اور جس بندہ نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا اس نے گویا کہ خدا تعالیٰ کی تعریف نہیں کی اس حدیث میں آپ نے حمد کو شکر کی بنیاد اس لئے قرار دیا کہ نعمتوں کا ذکر زبان سے بہ نسبت اعتقاد کے زیادہ شائع و ذائع ہے اور اسی طرح اعضاء کے مقابل میں بھی اس کی یہی حیثیت ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ کسی کے دل میں کیا ہے اس کو کون جان سکتا ہے اور جسم سے کسی کی خدمت کرنے میں بھی بہت سے احتمال ہو سکتے ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ زبان کی تعریف ہی بنیاد ہے۔ حمد کی نقیض ذم ہے اور شکر کی مخالف صفت، کفران نعمت اور حق ناشناسی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ مدح خدا تعالیٰ، ان صفات

کمالیہ کی تعریف و ثنا کرنا ہے جو صرف خدا تعالیٰ ہی کے لئے ثابت ہیں اس کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں۔ مثلاً خدا تعالیٰ کا باقی ہونا، قادر ہونا، عالم ہونا، ازلی اور ابدی ہونا اور شکر خدا تعالیٰ کے یہاں سے جو مخلوق کو فضائل تقسیم ہوتے ہیں ان کی تعریف و ثنا کرنے کا نام ہے اور حمد، شکر اور مدح دونوں کے مفہوم پر محیط و حاوی ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ الحمد پر الف ولام اہل سنت کے خیال کے مطابق استغراق کا ہے معتزلہ اگرچہ اس میں خلاف کرتے ہیں اور کیونکہ الف ولام استغراق کا ہے یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے نام کے ساتھ متصل کہا گیا کیونکہ اللہ۔ اسم ذات ہے جس میں تمام صفات کمالیہ موجود ہوں گی۔ معتزلہ کا یہ اختلاف اسی مشہور "خلق افعال" کے مسئلہ پر اختلاف کا نتیجہ ہے جس کی تفصیلات مناسب مواقع پر کی گئی ہیں۔

عالم کا پالنہار

"رب العلمین" میں دو لفظ ہیں ایک "ربّ" اور دوسرا "عالم" "ربّ" کے معنے مالک کے آتے ہیں۔ صفوان نے ابوسفیان سے کہا تھا "لان یربّنی رجل من قریش احبّ الیٰ من ان یربّنی رجل من ھوازن" یعنی اگر قریش کا کوئی آدمی میرا مالک ہوتا تو زیادہ بہتر تھا بہ نسبت اس کے کہ ہوازن کا کوئی فرد و بشر میرا مالک ہو۔ صفوان کے اس مقولہ میں ربّ مالک ہی کے معنے میں استعمال ہوا ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ ربّ مصدر ہو اور مبالغہ کے لئے بطور صفت کے استعمال ہو گیا جیسا کہ "زید عدل" میں زید کا وصف "عدل" کو قرار دیا ہے مصدر ہے، لیکن مبالغہ کے طور استعمال ہو گیا۔ یہ نکتہ خاص طور پر پیش نظر رہے کہ ربّ کا استعمال خدا تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لئے نہیں ہو سکتا اگر کہیں استعمال بھی ہو گا تو بعض قیودات کے ساتھ۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام نے عزیز مصر کے لئے انہ ربّی احسن مثوای استعمال کیا لیکن ظاہر ہے کہ مطلقاً نہیں بلکہ "احسن مثوای" کی قید کے ساتھ یا "ارجع الی ربک" میں ربّ کا استعمال غیر خدا کے لئے ہے، لیکن مقید ہی ہو کر استعمال ہے۔ واسطی نے اچھی بات کہی کہ ربّ ابتدا میں تو خالق ہوتا ہے اور عمر کے تمام حصوں میں مربّی ہوتا ہے اور اخیر میں گناہوں کو معاف کرنے والا اور توبہ کو قبول کرنے والا ہوتا ہے۔ بہر حال ربّ بھی خدا تعالیٰ کا ایک نام ہے۔

دوسرا ٹکڑہ یعنی عالمین عالم کی جمع ہے اور عالم ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے خالق کا تعارف حاصل ہو خواہ وہ چیز اجسام سے ہو یا جواہر سے یا پھر اعراض سے اور بعض کی رائے ہے کہ عالم خدا تعالیٰ کے سوا ہر چیز کا نام ہے اور عالم کو عالم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کے وجود باجود کی ایک دلیل محکم اور ناقابل تردید ثبوت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں یہ اشکال ہو کہ عالم تو غیر عقلاء پر بھی شامل ہے اور واؤ اور نون کے ساتھ جو جمع کی جاتی ہے وہ عقلاء ہی کے لئے خاص ہے تو پھر یہ جمع واؤ اور نون کے ساتھ کیوں استعمال ہوتی؟ حل اس اشکال کا یہ ہے کہ اس میں وصفیت کے معنے موجود ہیں یعنی علم کے معنے پر دلالت اور یہ نکتہ جمع نون اور واو کے ساتھ استعمال کرنے کے لئے کافی ہے۔

رحمٰن ورحیم

ان سے متعلقہ مباحث بسم اللہ میں گذر چکے اس نکتہ کو مت بھولئے کہ سورۂ فاتحہ میں الرحمٰن اور الرحیم کا ذکر اس کی دلیل ہے کہ تسمیہ سورۂ فاتحہ کا جزو نہیں کیونکہ اگر جزو ہوتا تو پھر سورۂ فاتحہ میں رحمٰن اور رحیم کے اعادہ کی کیا ضرورت تھی خصوصاً جب کہ اس مکرر ذکر میں کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آتا۔

یوم الحساب

"مالک" کو بعض علماء "ملک" بھی پڑھتے ہیں جس میں ایک خاص فائدہ اضافت کی عدم ضرورت ہے۔ نیز قرآن مجید میں "لمن الملک الیوم" بھی استعمال ہوا ہے اور یہ بھی ہے کہ ہر ملک مالک ہوتا ہے اور مالک کے لئے ملک ہونا ضروری نہیں اور ملک کا حکم مالک پر بھی چلتا ہے لیکن مالک کا حکم ملک پر نافذ نہیں۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر ملک کو مالک کے مقابلے میں زیادہ ترجیح دی گئی ہے اگرچہ بعض علماء کی یہ بھی رائے ہے کہ مالک میں حروف

زیادہ ہیں اس لئے ملک کے مقابلے میں مالک میں زیادہ ثواب ہوگا۔ امام ابو حنیفہ اور حسن رضی اللہ عنہما "ملک" ہی پڑھتے ہیں۔

یوم الدین یوم الجزاء کو کہتے ہیں۔ عرب استعمال کرتے ہیں کہ کما تدین تدان جیسا کروگے ویسا ہی بھروگے۔ ترکیب کے اعتبار سے اسم فاعل کی ظرف کیطرف اضافت ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ یوم الجزاء کے تمام معاملات صرف خدا تعالیٰ ہی کے حکم سے طے ہوں گے۔ یوم الدین کی تخصیص سے یہ ہرگز مت سمجھنے کہ دنیا کا مالک کوئی اور ہے ہرگز نہیں دنیا کے بھی مالک وہی ہیں لیکن دنیا میں بعض مصالح کے پیش نظر خدا تعالیٰ نے اقتدار انسانوں کے ہاتھوں میں تھوڑا بہت منتقل کر دیا ہے اور رہا یوم الجزاء تو اس دن صرف حکم خدا ہی کا ہوگا اور کسی کی شرکت نہ ہوگی۔ یہاں یہ نکتہ خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی جو صفات و خصوصیات ذکر کی گئی ہیں مثلاً رب العلمین، الرحمن الرحیم اور مالک یوم الدین اور ان صفات سے پہلے الحمد کا ذکر تھا اس اسلوب سے سمجھانا یہی ہے کہ حمد کا مستحق صرف خدا ہی ہے اور کوئی نہیں کیونکہ حمد اس کی ہونی چاہئے جس میں یہ صفات ہوں اور یہ صفات خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور میں پائی نہیں جاتیں اس لئے حمد کا مستحق بس وہی ہے اور کوئی نہیں۔

عبادت و استعانت "ایّا" خلیل اور سیبویہ کے خیال کے مطابق اسم ضمیر ہے اور سیبویہ کا خیال ہے کہ "ایاک" میں "ک" خطاب کے لئے ہے اور اس کا کوئی نہ اعراب نہ محل اعراب اور خلیل کہتے ہیں کیونکہ یہ فاعل اور مفعول دونوں پر مقدم ہوا اس لئے اسم ظاہر کے مشابہ ہے اس لئے اسم ضمیر ہے جس کی جانب "ای" کی اضافت کی گئی ہے۔ کوفی کہتے ہیں کہ "ایاک" اسم ہے اور مفعول یعنی "ایاک" کو فعل یعنی نعبد و نستعین پر تخصیص کیلئے مقدم کیا گیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم بس آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور صرف آپ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں عبادت خود کو کسی کے سامنے بالکل درماندہ و عاجز سمجھنے کا نام ہے۔

عربی اسلوب میں یہ انداز مسلسل چلا آتا ہے کہ ابھی ایک غائب کی حیثیت میں گفتگو کر رہے ہیں اور اچانک حاضر و موجود کے لب و لہجہ میں گفتگو شروع کر دی یا متکلم کے پیرایہ میں اور پھر اچانک خود کو غائب تصور کر لیا۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے کہ "حتی اذا کنتم فی الفلک وجرین بھم بریح طیبة" اور اسی طرح "واللہ الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقناہ" پہلی آیت میں خطاب سے غیبت کی طرف اور دوسری آیت میں غائب سے متکلم کی جانب التفات کیا گیا ہے۔ اسی طرح امرء القیس عرب جاہلیت کا مشہور شاعر اس کی ابیات میں کہ تطاول لیلک بالاثمد الخ میں التفات بکثرت ہوا ہے بہرحال عرب والوں کا دستور ہے کہ وہ اس طرح کلام میں التفات کو نہایت پسندیدہ اور مرغوب سمجھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کلام کے اس اسلوب سے مخاطب کو نشاط اور ایک لافانی سرور حاصل ہوتا ہے اور بعض مواقع پر تو اس التفات کے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں جن کو خاص خاص علماء ہی جان سکتے ہیں۔ بہرحال سورۂ فاتحہ میں التفات ہوا اور اس التفات سے ایک خاص فائدہ ہوا جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ جب ماقبل کی آیات میں اس ذات گرامی کی نشاندہی کی گئی تھی جو کہ واقعی حمد و ثنا کا مستحق ہے اور جس کی چند بڑی بڑی صفات ذکر کی گئی تھیں اور ظاہر ہے کہ خصوصیات یا اوصاف کے ذکر کرنے سے کسی کی شخصیت فی الجملہ متعین اور متعارف ہو جاتی ہے اس لئے "ایاک" کے ساتھ اس طرح خطاب شروع کرنا گویا کہ وہ سامنے موجود ہے اور اس سے مشافہۃً گفتگو ہو رہی ہے بلاغت کی جان اور ایک کامیاب انشاء کی خوشگوار روح ہے۔ گویا کہ ایک بے قرار انسان کی روح جو اپنے خالق اور منعم کی تلاش میں سرگرداں تھی، اچانک اپنی تلاش کو کامیاب پاکر جھومتے ہوئے نعروں اور شہرت انگیز لب و لہجہ میں ترنم سرا ہوتی ہے کہ "اے وہ ذات گرامی جس کی میں جستجو و تلاش میں تھا جو میرا رب ہے میرا معبود ہے، رحمن ہے اور رحیم ہے، میں تیری ہی عبادت کرتا ہوں اور اپنی ہر ضرورت میں تجھ ہی سے امداد طلب کرتا ہوں۔

نکتہ عبادت کو استعانت پر مقدم کر دیا گیا جیسا کہ نعبد و نستعین کی ترتیب سے ظاہر ہے یہ اس لئے کہ عبادت ایک

وسیلہ کی حیثیت میں ہے اور استعانت اپنی ضرورتوں کو طلب کرنے کا عنوان ہے اور معلوم ہے کہ وسائل ضرورتوں کی طلب پر بہر حال مقدم ہوتے ہیں۔

اور ہو سکتا ہے کہ آیات کے نظم کو باقی رکھنے کے لئے عبادت کو مقدم کر دیا گیا ہو جیسا کہ رحمٰن کو رحیم پر مقدم کیا تھا حالانکہ رحیم کی تقدیم زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ استعانت کے بعد یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ بندہ خدا تعالیٰ سے کیا چاہتا ہے بلکہ کسی بھی مقصد اور غرض کو استعانت کے بعد ذکر ہی نہیں کیا گیا اس سے یہی سمجھانا ہے کہ بندہ کو اپنی ہر ہی ضرورت میں چھوٹی ہو یا بڑی خدا تعالیٰ ہی سے اعانت طلب کرنا چاہئے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعانت، عبادات کی ادائیگی کے سلسلہ میں مطلوب ہے، جیسا کہ آئندہ آیت یعنی "اھدنا الصراط المستقیم" سے معلوم ہوتا ہے۔

سیدھی راہ

ہم کو سیدھی راہ کی ہدایت کیجئے (اھدنا الصراط المستقیم) مطلب یہ ہے کہ آپ نے جو اسلام کی توفیق عطا فرمائی ہے اب اس پر قائم رکھئے۔ ظاہر ہے کہ مسلمان تو ہدایت یافتہ ہے ہی اس لئے از سرِ نو ہدایت کی دعاء کیا معنے رکھتی ہے۔ اس لئے کہنا ہوگا کہ جو ہدایت نصیب ہو چکی اس ہدایت پر استقامت کی دعاء بندہ خدا تعالیٰ سے کر رہا ہے۔ مثلاً کوئی شخص کھڑا ہوا ہو اور آپ پھر اس سے کہیں کہ میاں کھڑے ہو جاؤ تو مطلب اس کا یہی ہوگا کہ کھڑے رہو بیٹھو مت، اسی طرح یہاں ہدایت پر استقامت کی دعاء ہے نفس ہدایت کی دعاء نہیں۔

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ آئندہ میں ہدایت کی دعاء ہو کہ اے اللہ آپ نے زمانہ حال اور ماضی میں ہم کو ہدایت سے سرفراز فرمایا۔ استقبال میں بھی ہدایت سے مشرف اور باعزت رکھئے۔

ہدایت عربی اسلوب کے مطابق خود ہی متعدی ہے ہاں مفعول زمانی تک اس کا تعدیہ کبھی تو مفعول اول کی طرح کسی حرف کی وساطت کے بغیر آتا ہے اور کبھی کسی حرف کے واسطہ سے مثلاً اس آیت میں مفعول ثانی تک تعدیہ حرف کے بغیر ہوا ہے اور "ھدانا لھذا" یا "ھدانی ربی الیٰ صراطِ المستقیم" میں لام یا الیٰ کے ذریعہ ہوا ہے یہ صراط اصل میں سراط تھا عربی میں کبھی کبھی س اور ص آپس میں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں سرط الشئی کے معنے کسی چیز کو نگلنا گویا کہ جو شخص کسی راستہ پر چلتا ہے تو وہ اس کو نگل جاتا ہے یعنی عبور کر لیتا ہے، طے کر لیتا ہے، صراط سبیل اور طریق کی طرح مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہو سکتا ہے۔ یہاں "صراطِ مستقیم" سے دین اسلام مراد ہے کیونکہ اسلام ہی سیدھا راستہ ہے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ سیدھا نہیں ہے۔

کونسا راستہ

بندہ نے سیدھی راہ کی دعا کی اور اس کے بعد اس راستہ کی تعیین کے لئے عرض کیا کہ وہ راستہ جس پر وہ لوگ چلتے رہے جن پر آپ نے رحمت کی تھی اور جنکو حق کے قبول کرنے کی دولت عطا فرمائی تھی گویا کہ "انعمت علیہم" صراط المستقیم" سے بدل ہے اور اس سے فائدہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی راہ ہی کو سیدھی راہ ثابت کرنے کے لئے یہ انداز اختیار کیا گیا کیونکہ مومنین، انبیاء اور گزشتہ زمانے کے باایمان اسی راہ پر چلتے رہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہ تھی۔

گم کردہ منزل

ان لوگوں کی راہ سے بچنے کی دعاء ہے جن پر خدا تعالیٰ کا غضب ہوا اور جو اپنی بدقسمتی اور بدعملی کی وجہ سے راہ سے بھٹک گئے، پس وہ گم کردہ راہ بھی ہیں اور گم کردہ منزل بھی۔ کیونکہ جن پر خدا تعالیٰ نے احسان فرمایا وہ مسلمان ہی ہیں اور یہی ہیں جو خدا تعالیٰ کے غضب سے محفوظ رہے اور گمراہی سے ہمیشہ بچے رہے گویا کہ اسلام کی دولت گمراہی سے نجات اور خدا تعالیٰ کے غضب سے سلامتی مسلمانوں ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ لازوال دولت کسی اور قوم کے حصہ میں

نہ آئی (اس موقع پر مصنف نے بعض ترکیب عربی سے متعلق مباحث ذکر کئے کیونکہ وہ عوام کے کام کی چیزیں نہیں اس لئے انکو قلم زد کر دیا گیا) اللہ کے غضب کا مطلب یہ ہے کہ خدا مکذبین سے انتقام لے گا اور ان پر اپنا عذاب مسلط فرمائے گا اور بادشاہ مقتدر اپنے ماتحت کی کسی ناگوار حرکت پر خفا ہو کر جو کچھ کرتا ہے خدا تعالیٰ آیات اللہ سے انکار کرنے والوں کے ساتھ وہی سب کچھ کرے گا۔ علماء کی رائے ہے کہ مغضوب سے یہاں یہود مراد ہیں جیسا کہ قرآن مجید کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے اور گمراہ فرقہ سے نصاریٰ مراد ہیں جیسا کہ اس احتمال کی بھی تائید بعض دوسری آیات سے ہوتی ہے۔ الضالین سے پہلے لا کو بصری زائد کہتے ہیں اور کوفیوں کے خیال میں یہ غیر کے معنے میں ہے۔

آمین آمین سورۃ فاتحہ کے ختم پر کہا جاتا ہے یہ اصل میں ایک لفظ ہے جو استجب فعل کے معنے میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ رویدا، امھل کے معنے میں مستعمل ہے یہ مبنی ہے اور اس میں دو لغت ہیں یعنی آپ اس کو کھینچکر پڑھیں یا بغیر مد کے پڑھیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آمین کے معنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کئے تھے تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ اس کے معنے ہیں "اے اللہ ہماری دعاء قبول کر لیجئے"۔

آپؐ کا ارشاد ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھ کو ختم سورۃ فاتحہ پر آمین کہنے کا ایماء کیا اور کہا تھا کہ آمین ایسا ہے جیسا کہ تحریر کے ختم پر مہر لگادی جائے۔ یہاں یہ یاد رکھئے کہ آمین قرآن مجید کا جز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس کو نہیں لکھا جاتا۔ (الحمد للہ کہ آج سورۃ فاتحہ بتاریخ ۳ رجب ۱۸۱ھ بروز منگل سورہ فاتحہ کی تفسیر ختم ہوئی)

سورۃ بقرہ مدنیہ میں نازل ہوئی اس کی ۲۸۶ یا ۲۸۷ آیات ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام جو بڑی مہربان نہایت رحم والے ہیں

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾ الَّذِیۡنَ

الم ف ۱ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ف ۲ راہ بتلانیوالی ہے خدا سے ڈرنیوالوں کو وہ خدا سے ڈرنیوالے لوگ

یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ

ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیز دنیا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اسمیں سے خرچ کرتے ہیں اور وہ لوگ

یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ

ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپکی طرف اتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جاچکی ہیں اور آخرت پر بھی

یُوۡقِنُوۡنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾

وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔ پس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب۔

مقطعات اور قرآن حکیم کے بعض رموز و اسرار سورہ بقرہ کے بالکل ابتداء میں الٓمّٓ کے الفاظ ذکر کئے گئے ہیں جن کو مفسرین کی اصطلاح میں مقطعات کہا جاتا ہے۔ ان مقطعات کے نظائر وہ اسماء ہیں جن کے مسمّیٰ حروف ہیں جن حروف سے کلمات کی ترکیب ہوتی ہے۔

مثلاً "قال" کو لیجئے قال کے شروع میں جو قاف ہے وہ گویا کہ قال کے ابتدائی حرف یعنی ق پر دلالت کرتا ہے۔ اور الف قال کے درمیانی حرف پر اور لام قال کے بالکل آخری حرف پر۔ ہماری تحقیق یہ ہے کہ یہ مقطعات اسماء ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے معنے پر دلالت کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ اسم اسی کو کہتے ہیں جو اپنے معنے پر دلالت کرتا ہے۔ نیز اسم میں جو صورتیں ممکن ہیں یعنی امالہ، تفخیم، تعریف، تنکیر، جمع، تصغیر، یہ سب چیزیں ان مقطعات میں بھی ممکن ہیں ان وجوہات کی بناء پر واضح ہے کہ مقطعات بھی اسماء ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ معرب ہیں اور جو اسماء ساکن ہو گئے تو وہ اس لئے نہیں کہ معرب نہیں تھے بلکہ ان کے ساکن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کوئی ایسی چیز نہ ہوگی جو اعراب کو چاہتی۔ اور کچھ علماء کہتے ہیں کہ مقطعات معرب نہیں بلکہ مبنی ہیں جیسا کہ اصوات وآوازیں مبنی ہیں مثلاً کتے کی آواز کی نقل میں (غاق) مبنی ہی ہے بہرحال یہ تو ایک علمی بحث تھی۔

آپ کے کام کی بات یہاں یہ جاننا ہے کہ یہ مقطعات ہیں کیا چیز، تو اکثر علماء کے خیال میں یہ سورتوں کے نام ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے ہے کہ ان مقطعات کے ساتھ خدا تعالیٰ نے قسم کھائی ہے گویا کہ ان کے خیال میں یہ حروف قسم ہیں اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ خدا تعالیٰ کے "اسماء اعظم" ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مقطعات، متشابہات ہیں جن کی حقیقت خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور کیونکہ ان کی حقیقت، ان کے معانی کسی کو بھی معلوم نہیں اسی لئے ان کو مبہمات (پوشیدہ چیزیں)

بھی کہتے ہیں۔

علماء کی ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ کیونکہ نزول قرآن مجید کے دور میں کفار و مشرکین نیز اسلام خلاف فرقے کہتے تھے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ محمد خود اس کو گھڑتے ہیں اور پھر خدا کا کلام کہدیتے ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کو خدا تعالیٰ کا کلام ثابت کرنے کے لئے ان ہی حروف سے جن سے عام طور پر کلمات کی ترکیب ہوتی ہے چند کلمات تیار کرکے رکھدیئے کہ لو اگر یہ محمد ہی کا کلام ہے جیسا کہ تم کہتے ہو تو پھر تم بھی ان کے معنے بتا سکتے ہو، بتاؤ ان کے معنے کیا ہیں" اور کیونکہ معنے بتانے سے عاجز رہے اس لئے ثابت ہوا کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے کسی فرد و بشر کا نہیں اور بعض کی رائے ہے کہ سورتوں کی ابتداء میں یہ مقطعات استعمال کرکے انسان کو قرآن کے اعجاز کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ سننے کے ساتھ ہی اس کو قرآن کے معجز ہونے کا یقین آجائے اور یہ اس لئے کہ ایک تو حروف کا تلفظ اور ایک ہے حروف سے تیار اسماء کا تلفظ جہاں تک حروف کے تلفظ کا معاملہ ہے تو اس میں خواندہ، ناخواندہ پڑھے لکھے، جاہل عالم سب برابر ہیں، لیکن حروف سے مرکب اسماء کا یہ حال نہیں، بلکہ ان کا تلفظ وہی کر سکتا ہے جس نے لکھنا پڑھنا سیکھا ہو جو اہل علم کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہو۔ اور ایک ایسا اُمّی (ناخواندہ) جس کا امی ہونا سبکو معلوم ہو (یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم) اور سب جانتے ہوں کہ یہ پڑھے لکھے نہیں ہیں جب وہ ایسا کلام پیش کریں جو قطعاً اہل علم کی خصوصیت ہے تو پہلے ہی وہلہ میں اس امّی سے یہ معجز کلام سنکر یقین آجائے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ خدا تعالےٰ قادر و توانا کا کلام ہے اور یہ کہ محمد کی یہ ایجاد بندہ نہیں بلکہ وحی کے علوم اور سرچشمے ہیں جو آپ کی زبان مبارک سے پھوٹ رہے ہیں اور اس طرح یہ معجز قرآن مجید آپ کی نبوت کی یہ وہ ناقابل تردید دلیل بن جائے۔

مقطعات کی بحث میں ایک علمی نکتہ

حروف معجم جن کی تعداد ۲۹ ہوتی ہے یعنی الف سے یاء تک، ان حروف میں سے نصف آیات کی ابتداء میں مجموعی طور پر آگئے ہیں اور قراء کے یہاں حروف کی جس طرح تقسیم ہے اس کے مطابق ان سورتوں کی ابتداء میں حروف جمع کر دیئے گئے۔ سب سے پہلے تو مہموسہ (اس صفت کا نام ہے جس کے سبب سے حرف کی آواز پست ہوجاتی ہے) کو لیجئے، مہموسہ ص، کاف، ھاء، سین اور حاء، نصف مہموسہ سورتوں کی

ابتداء میں موجود ہیں اور ایسے مجہورہ (اس صفت کو کہتے ہیں جسکی وجہ سے حرف کی آواز بلند ہو جاتی ہے) ہیں کے بھی نصف آگئے۔ یعنی الف، لام، میم، الراء، العین، الطاء، القاف، الیاء، النون اور ایسے ہی شدیدہ (اس صفت کا نام ہے جسکی وجہ سے آواز سخت ہو جاتی ہے اس طریقہ سے کہ حرف کی آواز بند ہو جاتی ہے) کے بھی نصف یعنی الالف، کاف، طاء، قاف اور رخوۃ (اس صفت کو کہتے ہیں جسکی وجہ سے حرف کی آواز نرم ہو جاتی ہے) کے بھی نصف یعنی لام، میم، الراء، الصاد، الھاء، العین، السین، الحاء، الیاء، النون، موجود ہیں اور اسیطرح مطبقہ (اس صفت کا نام ہے جسکو ادا کرتے وقت زبان کا اکثر حصہ تالو سے پٹ جاتا ہے) کے بھی نصف میں یعنی صاد، طاء اور مفخمہ (وہ حروف جو پُر ہوتے ہیں۔ یہ تفخیم سے مشتق ہے) کے بھی نصف آگئے یعنی الالف، لام، المیم، الراء، الکاف، الھاء، العین، السین، الحاء، القاف، الیاء، النون، اور مستعلیہ (اس صفت کا نام ہے جسکے ادا کرتے وقت زبان کا اکثر حصہ جڑ کیطرف سے تالو کیطرف بلند ہو جاتا ہے) کے بھی نصف میں یعنی قاف، صاد، طاء، اور منخفضہ (اس صفت کا نام ہے جسمیں ادائیگی کے وقت زبان تالو کیطرف نہ اُٹھے) کے بھی نصف ہیں یعنی الف، لام، میم، راء، کاف، ھاء، یا، عین، سین، حاء، النون۔ اور حروف قلقلہ (اس صفت کا نام ہے جسکی وجہ سے مخرج میں جنبش ہو سکے جسکے سبب سے حرف کی آواز بلکہ دوبارہ پیدا ہو جائے) کے بھی نصف ہیں یعنی قاف اور طاء یعنی جن حروف کا ذکر آیا اور جن کا ذکر نہیں ہے ذکر نہ ہونے والے ذکر ہونے والوں سے زیادہ ہیں۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اگر کسی چیز کا اکثر حصہ جمع ہو جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ وہ تمام چیز جمع ہو گی (مثلاً اگر کسی جماعت میں پچاس آدمی شریک ہیں اور ان میں سے ۳۵ یا ۴۰ جمع ہو جائیں تو سمجھا جائے گا کہ اکثریت ہو گی اور ان ۳۵ یا ۴۰ کو پچاس ہی کا قائم مقام تصور کر لیا جاتا ہے) تو خدا تعالیٰ نے حروف ہجی کے بیشتر حروف اس موقع پر جمع کر کے عرب کے معاند طبقہ کو سمجھانا چاہا ہے کہ دیکھو وہی حروف ہیں جن سے تم کلمات کی ترکیب کرتے ہو کہیں باہر سے کوئی حرف نہیں لایا گیا، پھر کیا بات ہے کہ انہی جانے پہچانے حروف سے مرکب کلمات کے معنے دریافت کرنے سے تم قاصر ہو مختلف سورتوں میں ان متعدد حروف کو جمع کرنے کا مقصد بھی یہی ہے تاکہ قرآن مجید کا وہ چیلنج کہ تم اس قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہو بار بار ان کے کانوں میں پڑتا رہے اور اس طرح ہر لمحہ ان کو قرآن مجید کے ایک کلام الٰہی ہونے کا یقین حاصل ہو۔ اور یہی راز ہے بعض مضامین کو قرآن مجید میں مکرر بیان کرنے کا تاکہ وہ مضامین سامعین کے ذہنوں میں اس طرح بیٹھ جائیں کہ غفلت اور ذہول ان کے اثرات کو زائل نہ کر سکیں اور یہ جو صورت اختیار کی گئی کہ بعض سورتوں کی ابتداء میں کُل دو حرف ذکر کئے گئے جیسا کہ حم، طہ یا بعض مواقع پر صرف ایک ہی حرف ذکر ہوا جیسا کہ "ق" یا "ص" یا "ن" اور کہیں تین لائے گئے جیسا کہ الم، یٰس، طسم اور کہیں اس سے زیادہ جیسا کہ "المص" "المرا" "کھیعص" اور "حم عسق" تو عربی اسلوب کی اباحت کے پیش نظر ہے کیونکہ عربی اسلوب میں بھی کلمات کی ترکیب کچھ اس طرح ہے کہ بعض دو حرف سے مرکب بعض تین سے چار سے پانچ سے وغیرہ وغیرہ۔

کوفیین کے مذہب کے مطابق الٓمٓ ایک مستقل آیت ہے اور ایسے ہی المص بھی، لیکن المر کو آیت نہیں کہتے اور اسی طرح الرا کو آیت شمار نہیں کیا۔ پانچوں سورتوں میں اس کو آیت شمار کرنے سے انکار کیا ہے۔ ہاں طسم کو آیت کہتے ہیں طہ اور یٰس کو بھی آیت مانتے ہیں لیکن طس کو آیت تسلیم نہیں کرتے۔ حم اس سورت میں آیت ہی کے حکم میں ہے حم، عسق کو دو آیت اور کھیعص کو ایک آیت کہتے ہیں اور ص، ن، ق تینوں کو آیت تسلیم نہیں کیا ہے، لیکن کوفیوں کے علاوہ کوئی اور ان کو آیت نہیں کہتا۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ ان کے آیت ہونے نہ ہونے کا مسئلہ درحقیقت سورتوں کی طرح ایک توقیفی مسئلہ ہے جسمیں قیاس کو کوئی دخل نہیں اور ان سب پر وقف کیا جانا چاہیئے بشرطیکہ ان کو مستقل معنے کی ادائیگی کے لئے اس طرح کافی سمجھ لیا جائے کہ تکمیل معنے کیلئے۔ بعد کے کلمات کو لاحق کرنے کی ضرورت نہ ہو اور نیز ان مقطعات کو سورتوں کے نام بھی قرار نہ دیئے جائیں بلکہ محض ایک صوت (آواز) کے حکم میں رکھا جائے۔

یا ان کو مبتداء محذوف کی خبر بنا لیا جائے۔ مثلاً یوں کہا جائے کہ الم اللہ یعنی ھذا الم کے حکم میں اور اسکے

بعد مثلاً اللہ لا الٰہ الا ھو الحیّ القیوم کی ابتدا ہو۔ جن علماء نے ان مقطعات کو سورتوں کے نام قرار دیئے ہیں ان کے خیال میں ان کا اعراب بھی ہے مثلاً وہ ان کو یا تو مبتدا ہونے کی بناء پر مرفوع پڑھتے ہیں یا قسم بنانے کے لئے جر اور نصب دیتے ہیں۔ بہرحال جو دوسرے اعلام و اسماء میں اعراب ہوتا ہے وہی اعراب یہاں بھی جاری کرتے ہیں۔ اور جو علماء ان کو اسماء و اعلام نہیں کہتے ان کے یہاں مفردات کی طرح ان کا کوئی محل اعراب بھی نہیں ہے، واللہ اعلم۔

ذٰلک الکتاب

ارشاد ہے یہ کتاب ایسی ہے کہ اس میں کوئی شبہ و شک نہیں کیا جا سکتا۔ سوال یہ ہوتا ہے کہ کونسی کتاب خدا تعالیٰ اس موقع پر مراد لے رہے ہیں تو بعض مفسرین کی رائے ہے کہ وہی قرآن مجید جس کے نزول کی اطلاع حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام برابر دیتے چلے آئے تھے کہ خاتم النبیینؐ پر ایک صحیفہ نازل کیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ اشارہ الٓمّٓ کی طرف ہو، لیکن یہاں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اشارہ اور مشارٌ الیہ میں مطابقت ہونا چاہئے اور یہاں مطابقت نہیں ہے کیونکہ اشارہ مذکر کا استعمال کیا گیا ہے یعنی ذلک اور مشارٌ الیہ سورۃ ہے اور وہ مؤنث ہے حل اس اشکال کا یہ ہے کہ اگر ہم ذلک کو مبتدا اور الکتاب کو اس کی خبر بنالیں تو مسمّاہ، معناہ وغیرہ کے معنے میں ہوگا اس لئے اس پر مذکر کے احکام جاری ہوں گے اور اگر خبر نہیں بلکہ صفت ہے تو پھر صراحتاً کتاب کی طرف اشارہ ہوگا اور اس طرح اشارہ اور مشارٌ الیہ میں مطابقت پیدا ہو جائے گی۔ بہرحال مطلب یہ ہوگا کہ قرآن مجید ہی درحقیقت ایک کامل اور مکمل صحیفہ ہے اور اس کے مقابل میں دوسرے صحیفے ناقص اور غیر مکمل ہونے کی

وجہ سے کتاب کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں جیسا کہ آپ کہہ دیں کہ بس آدمی تو یہی ہے مطلب یہ ہوگا کہ اس میں وہ تمام خصوصیات بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ایک انسان میں ہونی چاہئیں (مصنف نے اس موقع پر کچھ تراکیب ذکر کی ہیں کیونکہ وہ عوام کے کام کی چیزیں نہیں ہیں اس لئے ان کو چھوڑ دیا گیا)۔

مرکز یقین و ہدایت

ارشاد ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا صحیفہ ہے جس کے منزّل من اللہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ریب، مصدر ہے استعمال ہوتا ہے۔ "رابنی" جب آپ کسی شبہ میں پڑ جائیں۔ ریب کا مطلب یہ ہے کہ آپ کسی معاملہ میں اس طرح شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں کہ آپ کا دل بے چین ہو اور سکون و اطمینان ذہنی قطعاً ختم ہو جائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ " دع ما یریبک الیٰ مالا یریبک" کہ ان چیزوں کو چھوڑ دو جن کے کرنے پر قلب مطمئن نہ ہو وہ کام کرو جس میں کوئی خلجان نہ ہو کیونکہ شک میں قلب کو نہ اطمینان ہوتا ہے اور نہ سکون۔ بخلاف ان امور کے جن میں معاملہ مشتبہ نہیں ہوتا۔ ان میں نہ بے چینی ہوتی اور نہ قلبی اضطراب، اہل عرب کے یہاں ایک اور لفظ استعمال ہے یعنی "ریب الزمان" یعنی ایسا زمانہ جس میں آدمی پریشان ہوں اور مصیبتوں سے دل گھٹتے جاتے ہوں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے "لا ریب فیہ" کہہ کر شکوک و شبہات کی قطعاً نفی کر دی یعنی قرآن مجید میں کوئی شک و شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا حالانکہ قرآن مجید میں کافی شبہات کئے گئے اور اس کا معاملہ شبہ سے خالی نہیں رہا تو کیا العیاذ باللہ قرآن کا اپنے بارہ میں یہ بیان غلط اور واقعہ کے خلاف ہے؟ حل اس اشکال کا یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق خدا تعالیٰ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے آسمانی صحیفہ اور منزّل من اللہ ہونے کے دلائل اس درجہ واضح اور اس قدر قوی موجود ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے اس کتاب کے بارے میں کوئی شبہ ہونا نہ چاہئے یہ مطلب نہیں کہ اس میں شبہ ہی نہ کیا جائے گا۔

(حاشیہ ۱۸ پر)

ایک نکتہ

ارشاد یہ فرمایا گیا ہے کہ "لا ریب فیہ" یوں نہیں فرمایا گیا کہ "لا فیہ ریب" کہ فیہ کو مقدم کر دیتے اور ریب کو مؤخر۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بہشت کی شراب کے متعلق ارشاد ہے کہ "لا فیہا غول" جس میں فیہا کو غول پر مقدم کر دیا گیا ہے۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ جب کسی دوسری چیز کے مقابلہ میں کسی کی کوئی فضیلت یا ترجیح ذکر کرنا ہو تو ظرف (فیہ) کو مقدم کر دیتے ہیں جیسا کہ دنیا کی شراب جس میں نشہ وغیرہ ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں بہشت کی شراب کا ذکر تھا۔ تو فیہا ظرف کو مقدم کر دیا گیا کہ بہشت میں ایسی شراب مومنین کو دی جائے گی جس میں کوئی سکر اور خمار نہ ہوگا۔ اب اگر یہاں فیہ کو مقدم کر کے یوں کہا جاتا کہ لا فیہ ریب تو مذکورہ بالا قاعدے کے مطابق مطلب یہ ہوتا کہ قرآن مجید کے مقابلہ میں کوئی اور کتاب ہے جس میں شک و شبہ ہے اور اس کے مقابلہ میں قرآن کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے، حالانکہ یہ غلط ہوتا کیونکہ قرآن مجید کا کسی خاص کتاب سے مقابلہ نہیں، بلکہ اس کی یہ اپنی ایک خصوصیت ہے۔ قراء کہتے ہیں کہ فیہ پر وقف ہونا چاہئے عام طور پر مشہور یہی ہے۔ لیکن عاصم اور نافع دونوں ریب پر وقف کرتے ہیں فیہ پر نہیں، واقف کے لئے ضروری ہے کہ خبر کی نیت کرے اور خبر فیہ ہے۔

رشد و ہدایت کا اُبلتا ہوا چشمہ

ہدیٰ مصدر ہے جیسے کہ بکا مصدر ہے۔ ہدایت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو مقصود تک پہنچا دیا جائے، کیونکہ ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں استعمال ہوتی ہے خود قرآن مجید نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا ہے کہ اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ کہ یہ وہ لوگ ہیں جو گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دیتے ہیں (اس موقع پر مصنف نے کچھ قرات و ترکیب نحوی سے متعلق تفصیل کی تھی کیونکہ وہ عوام کی چیز نہیں اس لئے اس حصہ کا ترجمہ ترک کر دیا گیا ہے)

بہرحال ارشاد ہے کہ قرآن مجید متقین کے لئے رشد و ہدایت کا ایک ابلتا ہوا سرچشمہ ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ متقین سے ہدایت یاب مراد ہیں اور ہدایت پر استقامت و مداومت مطلوب ہے جیسا کہ آپ ایک بادشاہ کو جس کو ہر قسم کی عزت اور جلال حاصل ہو دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ کو عزت و جلال عطا فرمائے۔ تو مطلب اس دعا کا یہی ہوگا کہ آپ کو جو عزت و جلال حاصل ہے خدا تعالیٰ اس کو دائم و قائم رکھے جیسا کہ مومنین سے یہ کہنے کا مطالبہ کیا گیا کہ اھدنا الصراط المستقیم کہ ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت کیجئے، ظاہر ہے کہ ایمان والے تو یقیناً صراط مستقیم پر ہی ہیں پھر اس دعا کا کیا موقع؟ جواب وہی ہے کہ ہدایت کی دعا نہیں بلکہ ہدایت پر استقامت کی دعا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ متقین کو متقین اس لئے کہہ دیا گیا ہو کہ وہ تقویٰ کو حاصل کرنے کی طرف متوجہ رہیں اگرچہ ابھی ان کو تقوے حاصل نہیں ہوا۔ جیسا کہ آں حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی مقتول کو قتل کیا تو مقتول کا مال و متاع اس قتل کرنے والے کو دیا جائیگا۔ یا ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ہے کہ "میاں جب تم حج کا ارادہ کرو تو پھر ذرا عجلت سے حج کر لیا کرو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بیمار بیمار ہو جائے، اب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جو ابھی قتل نہیں ہوا قتیل فرمایا اور ابن عباس رض نے بیمار نہ ہونے والے کو بیماری کے خطرہ کی وجہ سے مریض کہا۔ اسی طرح اس آیت میں متقین ان لوگوں کو کہہ دیا گیا جو تقویٰ حاصل کر رہے ہیں اور جنھوں نے ابھی تک اس کی تکمیل نہیں کی (عوام اس کو یوں سمجھیں کہ عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے کو سب ہی "مولوی صاحب" کہتے ہیں حالانکہ ابھی تو اس نے ابتدا کی ہے بڑی مدت کے بعد کہیں جا کر وہ "مولوی صاحب" ہوگا۔)

قرآن کی اس معجزانہ بلاغت سے غفلت نہ کیجئے کہ یہاں یوں نہیں فرمایا گیا کہ یہ قرآن گمراہوں کے لئے باعث ہدایت اور نسخہ شفا ہے

عہ جیسا کہ آفتاب کے آسمان پر نور افشاں ہوتے ہوئے اس کے طلوع پذیر ہونے کا انکار نہ ہونا چاہیئے اور اگر کوئی کرتا ہے تو وہ اپنی حماقت کا ثبوت دیتا ہے اس کی اس حماقت سے واقعات غلط نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح قرآن مجید کا معاملہ اتنا صاف ہے کہ کوئی شخص اس پر کوئی واقعی شبہ نہیں کر سکتا جو کرتا ہے خود اس کی کور باطنی کا قصور ہے قرآن کی کوئی کوتاہی نہیں ۱۲

(حاشیہ صفحہ ۱۷)

بلکہ کہا گیا کہ ہدایت یافتہ لوگوں کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے۔ یہ اس لئے کہ دو فرقے ہیں۔ ایک تو وہ جن کا گمراہی پر رہنا معلوم ہے، اور دوسری وہ جماعت جس کا ہدایت کی طرف آنا معلوم ہے۔ پس یہ قرآن ہدایت کا نسخہ مکمل انھیں کے لئے ہے جن کا ہدایت کی طرف آنا متوقع ہے۔ اب اگر یوں کہا جاتا ہے کہ "یہ قرآن مجید ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جن کا گمراہی سے نکل کر ہدایت حاصل کرنے کی زبردست توقع اور امید ہے۔" تو ظاہر ہے کہ بات لمبی ہو جاتی حالانکہ قرآن مجید اختصار کو زیادہ اہمیت دیتا ہے تو مراد تو یہی ہے جس کی ترجمانی یہ طویل عبارت کرتی ہے لیکن اختصار کے پیش نظر عبارت مختصر کر دی گئی، اور ساتھ ہی یہ بھی مقصود ہے کہ قرآن کی یہ پہلی سورت ہے اس لئے اس میں ابتدار خدا تعالیٰ کے نیکوکار بندوں کی ذکر سے ہو تو مناسب اور بہتر ہے اس لئے بجائے هدیً للضالین کے هدیً للمتقین فرمایا گیا۔

متقی اسم فاعل کا صیغہ ہے اہل عرب استعمال کرتے ہیں وقاۃ فاتقی فار کی جگہ واؤ ہے اور لام کلمہ کی جگہ یار ہے، اور جب اس کو باب افتعال میں لے جاتے ہیں تو واؤ، تار سے بدل جاتی ہے اور اس تار کا دوسری تار میں ادغام ہو جاتا ہے اور اتقی پڑھتے ہیں۔ لغت

کے اعتبار سے وقایہ کے معنی "کامل حفاظت کرنا" ہیں اور شریعت میں تقوی کا مطلب یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے خود کو روکے جن کے ارتکاب سے وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں مجرم اور عذاب وعقاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان جن ممنوعات کا ارتکاب کرتا ہے اس میں بعض تو وہ ہوتی ہیں جن کے کرنے سے روکا جاتا ہے (مثلاً حکم ہے کہ شراب نہ پیو، زنا نہ کرو، جُوا نہ کھیلو، لواطت نہ کرو وغیرہ) اور وہ اُن کو کرتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض چیزوں کو کرنے کا حکم ہوتا ہے اور انسان اُن کو نہیں کرتا ہے (مثلاً حکم ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ دو، اگر حج فرض ہے تو حج کرو اور وہ نہیں کرتا) بہر حال تقوی کا تعلق کرنے والے امور اور نہ کرنے والے امور دونوں سے ہے (اس کے بعد مصنف نے بعض تراکیب نحوی لکھیں جن کو عوام کے خیال سے مترجم کا قلم چھوڑتا ہے) قرآنی اعجاز کی داد دیجئے کہ سب سے پہلے تو اعلان کیا گیا کہ کلام کا مقابل پیش کرو اگر کر سکتے ہو، پھر اس کے بعد بتایا گیا کہ وہ کلام جس کا مقابل لانے سے تم عاجز ہو یہی صحیفہ ہے جو ہر طرح کامل و مکمل ہے گویا کہ اس دوسری عبارت سے اسی چیلنج کی تاکید ہو گئی جو اولاً دیا گیا تھا، تیسرے مرحلہ پر پُرزور الفاظ میں کہا گیا کہ اس کلام میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا گویا کہ یہ اعلان اس صحیفہ کے کامل ہونے کی ایک قوی شہادت تھی کیونکہ یہ بات واضح ہے کہ حق ویقین سے بڑھکر کسی چیز میں کمال نہیں اور شکوک وشبہات یا باطل پرستی سے بڑھکر کوئی نقص اور عیب نہیں ہے۔

چنانچہ کسی عالم سے دریافت کیا گیا تھا کہ حضرت! آپ کے علمی ذوق کی اصل تشنگی کہاں دور ہوتی ہے؟ تو جواب دیا تھا کہ میاں! لذت تو اس حجت اور دلیل میں آتی ہے جو خوب واضح ہو یا پھر ان شبہات میں جس کو حل کرنے میں کچھ وقت صرف ہو۔ اور چوتھی منزل پہ یہ واضح کیا گیا کہ یہ صحیفہ اتقیار کیلئے نسخہ شفا و ہدایت ہے۔ گویا یہ مضمون پوری تاکید کے ساتھ صاف کر دیا گیا کہ یہی وہ صحیفہ ہے جس میں کسی بھی قسم کا شبہ کیا ہی نہیں جا سکتا، ایک ایسا حق ہے جس میں باطل کی کوئی آمیزش نہیں، ایک سچائی ہے جس میں جھوٹ کی کوئی ملاوٹ نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان چار مرتب مضامین میں جن کی ترتیب ہم نے ذکر کی ہے ہر مرحلہ پر کچھ اور بھی لطافتیں پیش نظر رہیں دیکھئے پہلے عنوان پر کچھ عبارت محذوف ہے اور مقصود عبارت کی جانب بڑا لطیف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اور دوسرے مرحلہ پر جو کچھ ذکر ہوا وہ معرّف باللام ہے جس سے اس کی عظمت کا درس مقصود ہے۔ اور تیسری منزل پر وہ لطافت و بلاغت جس کا مفصل ذکر ہم ریب کے تقدیم اور ظرف (فیہ)

سلہ جنگ اور جہاد کے موقعہ پر امام وقت، مسلمان فوجوں کی ہمت افزائی کے لئے اس قسم کا اعلان کر سکتا ہے کہ جس مجاہد نے کسی خاص فوجی کو مار ڈالا تو اس کافر کا تمام سامان واسباب اسلحہ اس مجاہد کو دیا جائے گا گویا کہ مال غنیمت جو تمام اسلامی فوج کا حصہ تھا ایک خاص مقصد یعنی ہمت افزائی کے لئے امام وقت اس کو مخصوص حصہ بھی کر سکتا ہے۔ اس حدیث میں یہی مراد ہے۔

کی تاخیر کے مبحث میں ذکر کر آئے ہیں۔ اور چوتھے موقعہ پر کچھ حذف ہے اور مصدر ھدی کو ھاد کی جگہ رکھ کر ایک ایسی جان فزا بلاغت پیدا کر دی جس کا جواب ممکن نہیں گویا کہ بتا دیا کہ یہ کتاب ہدایت نہیں بلکہ ہادی و راہ نما ہے اور ھدی کو نکرہ کی صورت میں ذکر کرنے سے یہ بھی آشکارا کرنا مقصود ہے کہ یہ ایک ایسی ہدایت ہے جس کی حقیقت تک تم پہونچ نہیں سکتے اور پھر متقین کا ذکر ہے جو عربی اور ادب کی جان ہے اس کا مختصر ذکر ہم کر آئے۔

متقین کے اُجاگر اوصاف

ابھی بتایا گیا...... تھا کہ قرآن مجید اتقیاء کے لئے رشد و ہدایت کا ایک مجرب اور کامیاب نسخہ ہے اس لئے اب یہاں سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ متقی ہیں کون ؟ آیت قرآن میں الذین واقع ہے جو ترکیب عربی کے اعتبار سے یا تو یوں کہیئے، مرفوع ہے یا منصوب، ہر دو حالت میں کہنا ہوگا کہ مرفوع یا منصوب علی المدح ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اتقیاء، وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ یا ترکیب یوں کیجئے کہ ھو مبتدا ہے اور اس کی خبر اولئک علی ھدی ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ مجرور رہو اس طرح کہ متقین کی صفت ہو اور متقین کے مفہوم کی وضاحت و تفصیل کے لئے اس کو استعمال کیا گیا ہو جیسا کہ آپ کہیں زید اور اس کے بعد اس کی دو خصوصیات ذکر کریں کہ وہ فقیہ اور محقق ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں صفات سے زید کی اس طرح نشان دہی مقصود ہے کہ زید کے تعارف میں کوئی ابہام نہ رہے۔ اسی طرح یہاں متقین کی اس طرح تفصیل پیش نظر ہے کہ کوئی گنجلک باقی نہ رہ جائے کیونکہ یہاں متقین کی دو ایسی اہم صفتیں ذکر کی ہیں جن سے ان کا تعارف مکمل طور پر ہو جاتا ہے۔

دیکھئے پہلے تو ذکر کیا کہ وہ ایمان لائے ہیں ظاہر ہے کہ ایمان تمام نیکیوں کی جڑ اور اصل ہے اور اس کے بعد بتایا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں (جو عبادت بدنی ہے) اور صدقہ دیتے ہیں (جو عبادت مالی ہے) اور یہی دو عبادتیں باقی عبادتوں کے لئے کسوٹی ہیں چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی نماز کو دین و اسلام کا ستون قرار دیا اور صاف اعلان فرمایا کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ مسلمان ہے اور جو نہیں پڑھتا وہ کافر ہے[1] اور آپؐ ہی نے زکوٰۃ کو ایک ایسا پل قرار دیا جس پر سے گذر کر آدمی اسلام کی شاہراہ پر آتا ہے۔

اس تفصیل کے بعد آپ سمجھے ہوں گے کہ تمام عبادتیں انھیں دو عبادتوں (یعنی عبادت بدنی اور عبادت مالی) کے محور پر گھومتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام دستور کے مطابق اس موقعہ پر عبادات کی لمبی چوڑی فہرست پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی بلکہ عبادات کا جوہر (ایمان) اور تمام عبادات کا محور ذکر کر دیا گیا، ساتھ ہی اس انداز سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ دونوں عبادتیں یعنی نماز و صدقہ سب سے افضل اور سب سے بہتر عبادتیں ہیں گویا کہ اصل مقصد پر یہ توضیح ایک لطیف مستزاد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ متقین کا مطلب تو صرف اتنا ہو کہ وہ گناہوں سے بچتے ہیں اور باقی صفات تقویٰ کے اس حقیقی مفہوم کے علاوہ دوسری خوبیوں کی وضاحت کرتی ہوں جیسا کہ ہم کہیں کہ فلاں شخص فقیہ ہے، متکلم ہے اور طبیب ہے، ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر صفت دوسری صفت کے مغائر مفہوم کی توضیح و تفصیل کر رہی ہے۔

غیب پر ایمان

یہ ہے وہ سب سے پہلی اور بنیادی صفت جو ایک مومن کو باقی انسانوں سے ممتاز اور جدا کرتی ہے۔ ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ مومن وہ ہے جو غیب پر ایمان رکھتا ہے۔ ایمان رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ اس نے آں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ان چیزوں کے بارے میں سنا جن کو وہ دیکھ نہیں سکتا (مثلاً جنت، جہنم، عذاب قبر، قبر کی راحت و آرام وغیرہ) آپؐ کی بلا تامل اور کسی تردد کے بغیر تصدیق کی۔ اور آپؐ کی دی ہوئی اطلاعات میں اس کو کوئی شائبہ کذب نظر نہیں آیا۔ یہاں ایمان کا تعدیہ بار کے ساتھ کر کے یہ بھی بتانا ہے کہ ایمان اقرار اور اعتراف کے معنی میں ہے اپنے عام معنی میں استعمال نہیں ہوا۔

---

[1] فقہاء کی نظر میں آپ کا یہ ارشاد تاکید اور نماز کے اہتمام کے لئے ہے تارک نماز کو حقیقۃً کافر قرار دینے کیلئے نہیں۔ فقہاء نے اسی لئے تارک نماز کو فاسق کہا ہے کافر نہیں کہا ہے اور ظاہر ہے کہ اگر اس حدیث کو بالکل ظاہر پر محمول کر لیا جائے تو آج لاکھوں مسلمان، مسلمان ہی نہیں رہتے کیونکہ نماز پڑھنے والوں کی تعداد کم اور نہ پڑھنے والوں کی زیادہ ہے۔ احادیث میں اس طرح کی وعید اکثر آجاتی ہے اور امت نے بالاتفاق وہاں ظاہری معنی کو چھوڑ دیا۔ انظر شاہ

اور یہ بھی ملحوظ رہے کہ غیب مصدر ہے لیکن غائب یعنی اسم فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یہ توجیہ تو اس وقت ہو گی جبکہ آپ بالغیب کو ایمان کا صلہ بنالیں لیکن اگر حال قرار دیں تو پھر اپنے معنی میں رہے گا اور مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں لینے کی کوئی ضرورت نہ ہو گی۔ مطلب یہ ہو گا کہ مومن وہ ہیں کہ ان چیزوں پر ایمان لائے ہیں جو ان کے سامنے نہیں ہیں مثلاً بعث و نشر، قیامت، برزخ، جنت جہنم اور خود باری عزاسمہٗ) یہاں ایمان کی حقیقت اور سن لیجئے اور پھر کبھی تردد میں مبتلا نہ ہوجیئے۔

یاد رکھئے ایمان نام ہے زبان سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی خبروں کی تصدیق کا اور پھر اپنی اس تصدیق کی اعضاء سے مزید تصدیق کا۔ ہاں ہمارے خیال میں "اعمال" ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں[۵] ہیں۔

اقامت صلوٰۃ

متقین کی دوسری صفت ذکر فرماتے ہیں کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، یہاں مقصود تو یہ ہے کہ نماز ادا کرتے ہیں لیکن "ادائیگی" کے لئے لفظ اقامت اختیار فرمایا حالانکہ قیام نماز کا اسی طرح ایک رکن ہے جس طرح رکوع، سجدہ، تسبیح وغیرہ نماز کے ارکان ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس لفظ کو اختیار فرما کر اس طرف اشارہ مقصود ہو کہ محض نماز پڑھنا کافی نہیں بلکہ اس کو اس طرح ادا کرنا ضروری ہے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اور یہ توجیہ ہم اس لئے کر رہے ہیں کہ اہل عرب استعمال کرتے ہیں اقام العود جب لکڑی کو ٹھیک اور بالکل درست کر دیا جائے، تو اقامۃ الصلوٰۃ کے معنی ہوں گے جب نماز کو مکمل طور پر ادا کیا جائے،

اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان الفاظ سے مقصود یہ ہو کہ نماز ہمیشہ ادا کی جاتی رہے کیونکہ عرب استعمال کرتے ہیں کہ قامت السوق یعنی بازار میں اب خوب خرید و فروخت ہو رہی ہے تو جب نماز ہمیشہ ادا کی جاتی رہے گی تو گویا کہ وہ ایک ایسی ہاتھوں ہاتھ لینے والی چیز ہو گی جس کی طرف سب متوجہ ہوتے ہیں اور اگر گنڈے دار نماز پڑھی جائے گی تو وہ اس ناقص اور نکمی چیز کی مانند ہو گی جس کی طرف کوئی بھی متوجہ نہیں ہوتا۔ صلوٰۃ، مشتق صلے سے ہے اور فعلۃ کے وزن پر ہے جس طرح زکوٰۃ زکیٰ سے مشتق اور فعلۃ کے وزن پر ہے لیکن لکھتے عام طور پر واؤ کے ساتھ ہیں۔ لغت کی رو سے یہ صلوٰۃ تحریک صلوین سے ماخوذ ہے صلوین (سرین) کو کہتے ہیں کیونکہ نماز میں نمازی کے سرین رکوع اور سجدہ میں حرکت کرتے ہیں اس لئے اس کو نماز کہا گیا اور دعا مانگنے والے کو جو مصلی کہا گیا تو وہ اس لئے کہ اس کو نماز پڑھنے والے کے اس خشوع سے مشابہت ہوتی ہے جو نمازی پر رکوع اور سجدہ میں طاری ہوتا ہے۔

صدقہ و خیرات

متقین کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کو دیا ہے خدا کی راہ میں اس کو خرچ کرتے ہیں، اس کو دیکھئے اور لطف لیجئے کہ مما میں من تبعیضیہ استعمال کیا اشارہ اس طرف ہے کہ متقین فضول خرچی نہیں کرتے کیونکہ وہ تو بالکل ممنوع ہے اور اس پر بھی نظر رکھئے کہ مفعول (رزق) کو فعل (انفاق) پر مقدم کر دیا گیا تاکہ تقدیم سے اہتمام کا اظہار ہو بس یہی وہ ادبی رعایتیں ہیں جن کی نظیر قرآن کے علاوہ اور کسی کتاب میں نہیں ملتیں ہو سکتا ہے کہ یہاں زکوٰۃ کا حکم دیا ہو کیونکہ نماز کے پہلو بہ پہلو عموماً زکوٰۃ ہی کا حکم ہوتا ہے اور اگر اس پر نظر رکھی جائے کہ ایک عام چیز ذکر کی گئی ہے زکوٰۃ کا خاص طور پر حکم نہیں تو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زکوٰۃ اور اس کے علاوہ تمام وہ صدقات مراد ہیں جو نیک نیتی کے ساتھ خدا کی راہ میں کئے جائیں۔ انفاق اور نفاذ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ یہاں یہ ادبی لطیفہ اور سن لیجئے کہ تمام وہ افعال جن کی فا کلمہ کی جگہ "ن" ہو اور "عین" کی جگہ فا ہو ان میں عموماً خرچ کرنے، نکل جانے، چلے جانے کے معنی پائے جاتے ہیں۔

غالباً اس اہم حقیقت پر تو آپ کی نظر یقیناً ہو گی کہ اس آیت سے اس خیال کی تردید خوب ہو رہی ہے کہ اعمال ایمان میں داخل ہیں

۵ یہ ایک اہم اختلافی بحث ہے کہ آیا اعمال، ایمان میں داخل ہیں یا نہیں؟ سیدنا شافعی الامام اور محدثین اعمال کو ایمان میں داخل مانتے ہیں اور امام اعظم عمل کو ایمان کیلئے تکمیل کا ذریعہ تو کہتے ہیں لیکن ایمان کا جز نہیں مانتے اس دور میں امام ابوحنیفہؒ کی رائے کی اصابت تو بالکل کھلی ہوئی ہے اگر ایمان کو عمل کے بغیر تسلیم ہی نہ کیا جائے تو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جو عمل سے قطعاً محروم ہے ایمان کی دولت سے محروم رہ جاتی ہے۔ یوں تو دلائل امام ابوحنیفہ کے مذہب کی صداقت پر بہت ہیں لیکن اسی دلیل پر غور کیجئے اور پھر لطف لیجئے۔ انظر شاہ

کیونکہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا ایمان پر عطف کیا گیا اور عربی قاعدہ کے مطابق عطف، مغائرۃ کو چاہتا ہے بات یوں بنی کہ ایمان کی حقیقت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے خلاف ہے اور ظاہر ہے کہ جب خلاف ہے تو صلوٰۃ و زکوٰۃ جو کہ اعمال ہیں ایمان کی حقیقت میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں۔

کچھ اور صفات ارشاد ہے کہ یہ دو اہم اور بنیادی صفات تھیں جو اتقیاء کا مخصوص حصہ ہیں اور رہے وہ حضرات جو پہلے کسی اور مذہب پر ایمان رکھتے تھے سو اگر اب وہ بھی تقویٰ کا اعلیٰ اور مقصود مقام چاہیں تو ان کو کیا کرنا چاہیئے اور ان کے امتیازی اوصاف کیا ہیں۔ تو فرمایا کہ اہل کتاب کا تقویٰ یہ ہے کہ وہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور آپ سے پہلے دوسرے انبیاء پر جو کچھ نازل ہوا تھا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب جیسا کہ حضرت عبداللہ بن سلام اور آپ کی طرح دوسرے کتابی، جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی تمام وحی پر ایمان رکھتے ہیں، اور جن کا اب یہ عقیدہ نہیں کہ وہی صرف جنت میں جائیں گے اور ان کے علاوہ کوئی اور جنت میں نہیں جائے گا کیونکہ یہود و نصاریٰ کا یہ عقیدہ ہے کہ جنت میں صرف یہود اور نصاریٰ ہی داخل ہوں گے اور کوئی داخل نہیں ہوگا۔ تو ایمان لانے کے لئے اس عقیدہ سے دست بردار ہونا ضروری ہے اور نیز اس واہی تخیل کو بھی چھوڑنا ہوگا کہ جہنم میں ہم صرف اتنے دن رہیں گے جتنے دن ہمارے آباء و اجداد نے گوسالہ پرستی کی یہ بھی یہود کی ایک گمراہی تھی، سو اس غلط عقیدہ کو بھی چھوڑنا ہوگا۔

نکتہ قرآن مجید کے اگر اس ٹکڑے یعنی والذین یومنون کی ترکیب بھی عجیب و غریب ہے کہ ذرا سے تصرف سے معنی بھی بدل جاتے ہیں مثلاً اسی والذین یومنون کا اگر آپ عطف الذین یومنون بالغیب پر کریں تو یہ اہل کتاب کے مومن بھی اتقیاء کی جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں اور متقین پر عطف کیا جائے تو پھر اتقیاء کے زمرہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا گویا کہ ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ یہ قرآن مجید سرچشمۂ ہدایت ہے اتقیاء کے لئے بھی اور ان کے لئے بھی جو کہ اہل کتاب میں سے ایمان لائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آخری صفت انھیں کی ہو جن کا پہلے سے تذکرہ چلا آ رہا ہے اور رہا یہ اشکال کہ پھر عطف سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ عربی قاعدہ کے مطابق متعدد صفات میں اس طرح کا عطف معیوب نہیں عربی اشعار میں اس کے نظائر بھی موجود ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہوگا کہ اتقیاء میں یہ تمام صفات بیک وقت موجود ہوتی ہیں۔

بما انزل الیك سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید مراد ہے کیونکہ آں حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر یہی کتاب ہے جو کہ نازل ہوئی ہے ہاں یہ ملحوظ رہے کہ مکمل قرآن مجید پر ایمان لانا ضروری ہے ایسا نہیں کہ صرف اسی حصہ پر ایمان لانا ضروری ہو جو اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے نازل ہو چکا تھا۔ بظاہر اگرچہ اس موقع پر ماضی کے صیغہ کے ساتھ ذکر کر دیا گیا حالانکہ ان آیات کے بعد بھی قرآن کے نزول کا سلسلہ برابر قائم رہا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ موجود کو غیر موجود یعنی نازل شدہ حصہ کو نازل ہونے والے حصہ پر غالب سمجھ لیا گیا اور اس طرح کے احتمالات تو عام طور پر چلتے ہی رہتے ہیں کہ اگر کسی چیز کا کچھ حصہ ہو گیا اور کچھ ابھی ہونا باقی ہے لیکن بے تکلف اس پر تکمیل کا حکم لگا دیتے ہیں۔ اسی طرح یہاں بھی نازل شدہ حصہ کو باوجودیکہ کچھ ابھی نازل ہونے والا ہے کل کے حکم میں لے لیا گیا۔

اور اہل کتاب کا ایمان یا عام مومنین کا ایمان صرف قرآن ہی پر ایمان لانے سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان تمام آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھیں جو آپ سے پہلے دوسرے انبیاء پر بھی نازل کی جاتی رہیں (باقی آسمانی کتابوں پر اتنا اجمالی ایمان کافی ہوگا کہ خدا تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر کتابیں ضرور نازل کیں اگرچہ موجودہ وقت میں جو تورات اور انجیل وغیرہ ہیں وہ اپنی اصل شکل و صورت میں موجود نہیں۔ جہاں تک عملی ایمان کا تعلق ہے یعنی کس کتاب کے احکام پر عمل کیا جائے تو وہ صرف قرآن مجید ہے کسی اور کتاب کے احکام پر عمل کرنا ہرگز صحیح نہیں یہی ایمان سابقہ کتابوں پر اسلام میں مطلوب ہے)

یقین آخرت متقین کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ آخرت، آخر کا مونث کا صیغہ ہے جو کہ اول کی ضد ہے اور آخرت صفت کا موصوف یہاں سے محذوف ہے جو کہ دار ہے کیونکہ قرآن مجید ہی نے دوسرے موقع پر تلك الدار الاخرة استعمال کیا ہے۔ یہ آخرت اور دنیا صفات غالبہ میں سے ہیں۔

نافع کا خیال ہے کہ اس میں تخفیف اس طرح ہونی چاہیئے کہ ہمزہ کو حذف کردیا جائے اور اس کی حرکت لام پر داخل کردی جائے۔ ہاں یقین کے متعلق اتنا ضرور سن لیجئے کہ یقین اس "علم" کو کہتے ہیں جس میں شک و شبہ قطعاً باقی نہ رہے تو گویا کہ آخرت پر یقین رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح آخرت پر یقین ہو کہ دل میں اس کی طرف سے کوئی شبہ ہرگز ہرگز باقی نہ رہے۔

ہدایت یافتہ گروہ

ارشاد ہے کہ جن اتقیاء کو ان تمام چیزوں پر اس تفصیل کے ساتھ ایمان و یقین ہو وہی لوگ ہدایت یافتہ اور فلاح یاب ہیں اولئٹ علیٰ ھدی ترکیب نحوی کے اعتبار سے محل رفع میں ہے بشرطیکہ الذین یومنون بالغیب کو مبتداء بنالیا جائے اور اگر اس کو مبتدا نہ قرار دیا جائے تو پھر اولئٹ علی ھدی کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے موصول کو متقین کے ساتھ خاص کردیا جائے اور ثانی کو مبتداء قرار دیکر مرفوع پڑھا جائے اور "اولئک" اس کی خبر ہو۔ اور ہدایت انھیں کی ایک مخصوص صفت ہو۔

اس موقع پر یہ استعمال فرماکر کہ فلاح یاب وہی ہیں جو آپ کی نبوت پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں اہل کتاب پر تعریض ہے کیونکہ وہ آپؐ کی نبوت پر ایمان نہیں رکھتے اور اس کے باوجود خود کو مومن بھی سمجھتے ہیں اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ ہم کو فلاح یاب کریگا۔

یہاں خدا تعالیٰ نے استعمال فرمایا کہ ہدایت پر ہیں اردو محاورہ تو یہی ہے لیکن عربی قاعدہ کے مطابق "ھدی" پر جو "علی" داخل کیا گیا وہ بلندی کے مفہوم کی ادائیگی کے لئے آتا ہے تو سوال پیدا ہوگا کہ ہدایت کے بلند ہونے کا کیا مطلب؟ تو یاد رکھنا چاہیئے کہ مراد ہدایت پر استقامت اور استقلال ہے جیسا کہ جو آدمی کسی چیز پر غالب آجاتا ہے تو گویا کہ وہ اس پر بلند ہوتا ہے، غالب ہوتا ہے، سوار ہوتا ہے اسی طرح یہ لوگ ہدایت پر غالب و سوار ہیں یعنی قائم ہیں اور ان کو ہدایت پر استقامت ہے علی الحق و علی الباطل وغیرہ کا مطلب بھی یہی ہے جو ہم نے "علی ھدی" کے سلسلہ میں بیان کیا۔ عرب کے یہاں اس طرح کی تراکیب بکثرت استعمال ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے گمراہی کو اپنی سواری بنالیا (یعنی گمراہ ہوگیا) فلاں جہل پر سوار ہوگیا، یا فلاں خواہشات پر سوار ہے سب کا مطلب وہی ہے جو ہم نے ذکر کیا۔

اور یہ جو فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر ہیں مطلب یہ ہے کہ ہدایت کی یہ توفیق خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے اُن کو ہے ورنہ ہدایت حاصل کرنا کسی کی بھی قدرت میں نہیں ہے۔ اس نکتہ پر ضرور نظر رکھئے کہ "ھدی" کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا، اشارہ اس طرف ہے کہ یہ ایسی ہدایت ہے جس کی حقیقت تک تم پہونچ بھی نہیں سکتے، گویا کہ اتنی بڑی ہدایت ہے کہ تخیل کی وسعت اپنی آفاقیت کے باوجود اس کا احاطہ نہیں کرسکتی۔

فلاح یاب جماعت

ارشاد ہے کہ یہی جماعت جس نے ایمان کو ان تمام تفصیلات کے ساتھ اختیار کیا اپنے مطلوب کو حاصل کرے گی اور ان خطرات سے یقیناً محفوظ رہے گی جن کے اندیشہ نے اُن کو ایمان کے پُرعافیت سایہ میں داخل کرنے پر اُبھارا (مثلاً خدا کے غضب کا خطرہ وغیرہ) - فلاح کے معنی لغت میں مقصود کو حاصل کرنا ہیں اور فلاح یاب وہ ہیں جنھوں نے اپنا مقصود حاصل کرلیا گویا کہ کامیابی اور کامرانی کے رخِ زیبا سے اس کے لئے نقاب اٹھادیا گیا اور لیلائے تمنا اس قیس بے تاب سے ہمکنار ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ فلاح کی ترکیب میں شق، چیرنے اور پھٹ جانے کا مفہوم ہے بلکہ ہر وہ کلمہ جس میں فا رکلمہ کی جگہ فا اور عین کلمہ کی جگہ لام ہو جیسا کہ فلج، فلذ، فلی وغیرہ۔ ان سب میں چرنے، پھٹ جانے کا مفہوم موجود ہے۔ اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ یہاں عطف کے ساتھ استعمال ہوا یعنی "اولئک" سے پہلے واؤ عاطفہ ہے بخلاف قرآن ہی کے دوسرے مواقع کے کہ وہاں واؤ عاطفہ کا استعمال نہیں ہوا مثلاً "اولئٹ کالانعام بل ھم اضل" میں واؤ اولئک سے پہلے نہیں یا اولئٹ ھم الغافلون میں واؤ موجود نہیں ہے۔ یہ فرق اس لئے پیش نظر رہا کہ یہاں خبر عطف کا تقاضہ کرتی ہے بخلاف غفلت اور جانوروں سے تشبیہ کہ وہ ایک ہی مفہوم کا دو پیرائے بیان ہیں اس لئے وہاں اتحاد کی ضرورت تھی مغائرت وہاں غیر مناسب ہوتی۔

گویا کہ اس دوسری خبر سے پہلی خبر کی تاکید ہوتی ہے کوئی نئی بات پیدا نہیں ہوتی۔ اس پیرایۂ بیان کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو اول وہلہ ہی میں محسوس ہو جاتا ہے کہ "اولٰئک" کے بعد جو کچھ ذکر ہو رہا ہے وہ خبر ہے صفت یا تاکید نہیں۔ اور یوں بھی ہو سکتا ہے کہ "اولٰئک" مبتداء ہو اور "مفلحون" خبر ہو اور پھر یہ پورا جملہ "اولٰئک" اول کی خبر بن جائے۔

اور اصل مقصود ان تمام تفصیلات کا یہ ہے کہ آپ اس لطیف پہلو سے غافل نہ ہوں کہ خدا تعالیٰ نے بار ہا اس جماعت کے ہدایت پر ہونے کا مفہوم کس انداز اور لطیف عنوانات سے بیان کیا ہے، تھوڑی سی تفصیل آپ بھی سن لیجئے، تاکہ کام و دہن اس لذت سے قطعاً ناآشنا نہ رہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ اسم اشارہ "اولٰئک" ذکر کیا گیا اور مکرر ذکر کیا گیا اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس جماعت کے لئے جس طرح ہدایت ثابت ہے ایسے ہی فلاح کے بھی بلا شرکت غیرے مستحق یہی ہیں۔

(۲) مفلحون پر الف لام تعریف کا داخل کیا گیا گویا کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ متقین وہ ہیں جن کے متعلق آپ کو بتایا گیا کہ وہی آخرت میں فلاح یاب ہوں گے جیسا کہ آپ کو کبھی معلوم ہو کہ ہمارے شہر کے فلاں آدمی نے توبہ کی تو آپ مثلاً دریافت کرنے لگیں کہ میاں وہ کون ہے جس نے اپنے جرائم سے توبہ کی ہے؟ اور اس کے جواب میں کہا جائے کہ "زید نے توبہ کی ہے" تو اسی طرح یہاں گویا کہ دریافت طلب امر یہ تھا کہ متقین کون ہیں؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ وہ ہیں جو آخرت میں فلاح یاب ہوں گے۔

(۳) تیسری لطافت یہ ہے کہ "اولٰئک" اور "مفلحون" کے درمیان "ہم" سے فصل کر دیا گیا یہ اس لئے تاکہ آپ ان متقین کے مراتب اور عالی مقامات پر مطلع ہو سکیں اور آپ میں بھی ان تمام نیکیوں کو اختیار کرنے کا جذبہ پیدا ہو جو انھوں نے کیں، یہ مقام حاصل کیا اور ان کے نیک اعمال کے تصور سے جو انھوں نے خدا کے یہاں بھیجی ہیں آپ کو مسرت اور روحانی سرور ہو۔

"اے اللہ! ہم کو بھی تقویٰ عطا فرما، بارالٰہا ہمیں بھی محض اپنے فضل و کرم سے ان کے زمرہ میں اٹھا جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے ابتداء (یعنی متقین) میں آیا، اور یا الٰہی ہمارا حشر ان کے ساتھ ہو جن کے متعلق آپ کہتے ہیں کہ یہ قرآن سرچشمۂ ہدایت انھیں کے لئے ہے۔ آمین یا رب العٰلمین۔"

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ خَتَمَ اللَّهُ

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ اُن کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لاویں گے بند لگا دیا ہے اللہ تعالیٰ نے

عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۖ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝

اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے اور اُن کے لئے سزا بڑی ہے

متقین کے بعد گمراہی پسند جماعت کے تذکرے

یہاں تک تو خدا تعالیٰ نے متقین کے حالات کا ایک مختصر ذکر فرمایا تھا اب کیونکہ قاعدہ ہے کہ صفات میں مختلف لوگوں کا تذکرہ پہلو بہ پہلو ہوتا ہے اس لئے یہاں سے ان بدقسمت کفار کے حالات کی تفصیل شروع ہوتی ہے جو خدا کے نافرمان، وحی الٰہی سے منہ موڑنے والے، کفر کے امام، گمراہی کے مٹتے ہوئے نقوش ہیں جن کو قرآن سے کوئی فائدہ نہیں، ہدایت سے جو سراسر محروم ہیں۔ ارشاد ہے کہ جو لوگ کافر ہیں خواہ آپ اُن کو خدا کے عذاب سے کتنا ہی ڈرائیں لیکن وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ "کفر" کے معنی ہیں حق کو انکار کے ساتھ چھپانا، کفر نعمت کی رو سے پوشیدگی کے معنی پر دلالت کرتا ہے چنانچہ عربی زبان میں کھیتی کرنے والے کو کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ دانوں کو زمین میں ڈال کر گویا کہ اُن کو زمین کے دبیز پردوں میں چھپا دیتا ہے۔ اور رات کو کافر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے سیاہ سیاہ پردے کائنات کے منور اور تاباں چہرہ کو اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ

ذرہ ذرہ تاریکی کے اوٹ میں چلا جاتا ہے۔

نکتہ قرآن مجید نے ایک دوسرے موقع پر مومنین اور کفار کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا انّ الابرار لفی نعیم وانّ الفجار لفی جحیم اس آیت میں مومنین کے احوال ذکر کرنے کے بعد کفار کا جب حال شروع کیا تو واوٗ عاطفہ ذکر فرمایا لیکن سورۂ بقرہ کی ان آیات میں یعنی ان الذین کفروا الخ کا ماقبل پر عطف نہیں کیا گیا یہ اس لئے کہ اس موقعہ پر پہلا جملہ کتاب اللہ کی تفصیلات سے متعلق تھا مومنین کے احوال کا تذکرہ مقصود نہیں تھا۔ اور یہ دوسری آیت کفار کے احوال سے اسی تفصیل کے ساتھ تعلق رکھتی ہے تو گویا کہ دونوں آیات اپنے مضمون کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں اتنی مختلف کہ ایک کو دوسرے سے جوڑنا درست نہیں، یہی وجہ ہے کہ عطف نہیں کیا بلکہ کفار کے احوال مستقل ذکر کئے گئے۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ یہاں مبتدا مقدر ہے تو پھر اس کا تعلق بھی اس سے ہو سکتا ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھئے کہ کفار سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جن کے متعلق خدا تعالیٰ کے علم میں یہ بات طے ہو چکی کہ وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے سوار۔ استوار کے معنی میں ہے سوار صفت ہے جیسا کہ کبھی کبھی مصادر بطور صفت کے استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید ہی میں دوسرے موقع پر استعمال ہوا ہے الیٰ کلمۃ سواءٍ یہاں پر بھی "واءٍ معنی... مستوی کے ہے، ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ سواء مرفوع ہے کیونکہ یہ انّ کی خبر واقع ہو رہا ہے اور ءانذرتھم ام لم تنذرھم فاعل ہونے کے بناء پر مرفوع ہیں۔ اس ترکیب نحوی کے بعد مضمون یہ ہوا کہ جو لوگ کفر پر اصرار کرتے ہیں ان کو آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے کیونکہ وہ ہرگز ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ اور یہ ترکیب بھی ہو سکتی ہے کہ سواء کو خبر مقدم کہئے اور جملہ "انذرتھم الخ" کو مبتدا موخر اور پھر یہ جملہ انّ کی خبر بن جائے معنے اس ترکیب پر بھی وہی رہیں گے۔

یہاں یہ اشکال ضرور ہوگا کہ فعل کو مبتدا بنانا کیسے صحیح ہوگا جبکہ فعل ہمیشہ خبر ہوتا ہے، جواب اس کا یہ ہے کہ یہ وہ موقع ہے جہاں الفاظ پر نظر نہیں رہتی بلکہ معنی پر توجہ کی جاتی ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ "ام" اور ہمزہ میں استفہام کے معنی پیش نظر نہیں رہے۔ سیبویہ کی یہی تحقیق ہے اور انذار کے معنی خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہیں۔

ہرگز ایمان نہ لائیں گے ارشاد ہے کہ آپ اپنی تمام ہی کوششیں کر کے دیکھ لیجئے لیکن معاند اور بدقسمت انسانوں کا یہ گروہ ہرگز ایمان نہ لائے گا (لا یؤمنون یہ جملہ معنے کے اعتبار سے پہلے جملہ سواءٌ علیھم الخ کی تاکید کرتا ہے انّ الذین میں جو انّ ہے اس کی خبر ہے اس صورت میں کہنا ہوگا کہ پہلا جملہ جملہ معترضہ ہے یا خبر کے بعد دوسری خبر ہے۔

یہاں یہ اشکال ضرور ہوگا کہ جب خدا تعالیٰ کے علم میں یہ بات تھی کہ انسانوں کی یہ جماعت یعنی ابوجہل اور ابولہب وغیرہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے تو پھر ان کو ایمان کی دعوت دینے اور خدا کے عذاب وغیرہ سے ڈرانے میں کیا فائدہ ہے؟ اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم ان آیات کے نزول کے بعد ان کو خدا تعالیٰ کے عذاب سے کیوں ڈراتے رہے؟ جواب اس کا یہ ہے کہ اول تو آپؐ ان پر اتمام حجت کرنا چاہتے تھے اس لئے آپؐ مسلسل دعوت دیتے رہے، نیز رسالت آپ کی عام تھی ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سب ہی میں آپؐ کو کام کرنا تھا اور یہ بھی وجہ تھی کہ آپ صرف تبلیغ کے مکلف تھے اور اس پر آپ کو بہر حال اجر ملے گا۔ تو آپؐ نے کوئی بیکار کام نہیں کیا بلکہ آپؐ کا کام مقاصد کے طویل سلسلہ پر پھیلا ہوا ہے۔

دلوں پر قفل ارشاد ہے کہ ان کے ایمان کی طرف سے مایوسی اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے دلوں پر قفل چڑھا دیا ہے، قرآن مجید نے اس موقع پر "ختم" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ "زجاج" نے کہا ہے کہ ختم کے معنے چھپا دینے کے آتے ہیں کیونکہ کسی چیز پر مہر لگا دینے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کو چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ دوسرے اس پر مطلع نہ ہو سکیں۔

اور ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کفر پر اصرار کی وجہ سے ان کے دلوں پر ایسی مہر لگا دی کہ اس کے ہوتے ہوئے دل کے اندر جو کفر کی گندگی موجود ہے وہ نکل نہیں سکتی اور خارج سے ایمان کی نورانیت ان کے دلوں میں اتر نہیں سکتی۔

اہل سنت والجماعت کے یہاں اس ختم اور طبع کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بندہ کا دل اس قدر تنگ اور اس میں ایک ایسی

ظلمت پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ بندہ ایمان یا کوئی بھی خیر قبول نہیں کر سکتا۔
اور معتزلہ کے یہاں اس ختم کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ فرشتوں کو اطلاع ہوتی ہے کہ یہ بندہ ہرگز ایمان نہ لائے گا پھر وہ اس کے لئے خیر کی دعا نہیں کرتے بلکہ اس کی حالت پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔

ایک اشکال اور اس کا حل

بڑا اشکال ان آیات پر یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بندوں کے دلوں پر ایسا قفل کیوں چڑھا دیتے ہیں کہ وہ بندے ایمان و خیر کے قبول کرنے ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کی کچھ آیات زیر بحث ہیں جن کے بعد یہ اختلافی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ افعال کا خالق خدا تعالیٰ ہیں یا خود بندہ؟ سو اس مسئلہ میں اہل سنت کا خیال یہ ہے کہ ختم اور طبع جیسی چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف مجازاً ہے حقیقت میں ایسا نہیں درحقیقت اس ختم اور طبع کا فاعل خود کافر ہے لیکن کیونکہ فعل کی قدرت خدا تعالیٰ ہی دیتے ہیں اس لئے مجازاً نسبت ان کی طرف کردی جاتی ہے اور اس طرح کی اسناد بالکل عام ہے مثلاً کبھی فعل کی نسبت سبب کی طرف کر دیتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ یہ عالی شان کوٹھی فلاں امیر نے بنائی حالانکہ سب جانتے ہیں کہ امیر نے گارا، چونا، اینٹ لے کر ایک معمار کی طرح تو کام کیا نہیں ہاں اس نے حکم دیا، مصارف بہم پہونچائے اور مکان بن کر تیار ہو گیا تو وہ صرف ایک سبب ہوا مکان کا تعمیر کرنے والا اس کو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے باوجود عرف عام میں مکان کے بنانے کی نسبت اس کی طرف کر دیتے ہیں۔
مختصر یہ کہ فعل کے بہت سے تعلق ہوتے ہیں کبھی فعل کی نسبت فاعل کی جانب ہوتی ہے کبھی مفعول کی طرف، مصدر سے تعلق ہوتا ہے ظرف سے، سبب وغیرہ سے تو فاعل کی جانب اسناد حقیقی اسناد ہے اور فاعل کے علاوہ دوسری چیزوں کی طرف نسبت ایک مجازی اسناد ہے اور رمز ان اشیاء کی جانب اسناد میں یہ ہے کہ یہ اشیاء کسی نہ کسی درجہ میں فاعل کے مشابہ ہیں جیسا کہ ایک بہادر آدمی بہادری میں شیر کے مشابہ ہوتا ہے بس اس تھوڑی سی مناسبت کو سامنے رکھکر بہادر آدمی کو شیر کہنے لگے حالانکہ اس کی اور شیر کی حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ضروری ہے کہ اس معاملہ میں اہل سنت کے عقیدہ اور فکر پر قائم رہنا چاہیئے اور ادھر ادھر کی باتوں پر کان نہ دھرنا چاہیئے

کانوں پر مُہر

ارشاد ہے کہ اس معاند گروہ کے دلوں پر قفل اور کانوں پر مہر لگی ہوئی ہے کہ یہ کوئی نیک بات سن نہیں سکتے۔ قرآن مجید نے اس موقع پر سمع کو مفرد استعمال کیا ہے حالانکہ قیاس چاہتا تھا کہ جمع کا صیغہ استعمال ہو کیونکہ جن کے کانوں پر مہر لگی ہوئی ہے وہ ایک جماعت ہے کوئی ایک شخص نہیں لیکن عربی زبان میں کبھی جماعت کے لئے مفرد بھی استعمال ہو جاتا ہے چنانچہ عربی شاعر نے اپنے اس مصرعہ میں بطن کو مفرد استعمال کیا ہے ع

کلوا فی بعض بطنکم تعفوا

اور یہ اس لئے کہ التباس کا کوئی خطرہ نہیں کہ جمع کا صیغہ استعمال کرنا ضروری ہو، نیز یہ بھی بات ہے کہ سمع مصدر ہے اور مصدر اسم جنس ہونے کی وجہ سے قلیل و کثیر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اس لئے اس کے مثنیٰ اور جمع وغیرہ لانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے یعنی اصل عبارت یوں ہے کہ مواضع سمعھم اور بعض قراتوں میں علی اسماعھم بھی موجود ہے۔ بہت سی صورتیں ہیں جن سے یہ عبارت صحیح ہوتی ہے۔

آنکھوں پر پردہ

اور جس طرح ان کے کانوں پر پردہ ہے اسی طرح ان کی آنکھوں پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے کہ یہ حق کو دیکھ نہیں سکتے، ترکیب نحوی کے اعتبار سے خبر ہونے کی بنا پر یہ مرفوع ہے اور ہو سکتا ہے کہ مبتدا مؤخر ہو۔ بصر۔ آنکھوں کی بینائی کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے آدمی دیکھتا ہے جیسا کہ بصیرت قلب کے اس نور کو کہتے ہیں جس کے ساتھ آدمی معاملات و مسائل پر صحیح رائے سوچ کر قائم کرتا ہے۔ گویا کہ بصارت اور بصیرت دو ایسے جوہر ہیں جو خدا تعالیٰ نے پیدا کئے جن میں ایک سے انسان دیکھتا ہے (بصارت) اور دوسرے سے سوچتا ہے (بصیرت) غشاوہ، فعالہ کے وزن پر ہے جس کے معنی پردہ کے آتے ہیں، فعالہ کے وزن پر عموماً آنے والے صیغے کچھ اس طرح کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ چیز دوسری چیز کو لپٹی ہوئی ہے مثلاً عمامہ (سر پر لپٹا ہوا ہوتا ہے) عصابہ پٹی جو زخم پر چڑھی ہوئی ہوتی ہے)

قلادہ (جو گلے وغیرہ میں پڑا ہوا ہوتا ہے) خدا تعالیٰ نے کانوں پر مہر کا حکم لگایا ہے اور آنکھوں پر پردہ کا۔ بعض خاص لطائف اس موقع پر اس طرح اختیار کیئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قلب اور کانوں پر یہ مہر نہایت قوت کے ساتھ لگی ہے۔

امام ابو منصور رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ انسان کو خدا تعالیٰ نے کان اسی لئے دیئے ہیں کہ وہ حق بات سنے اور آنکھیں اس لئے کہ وہ حق میں غور کرے وہ خود پر نظر کرے پھر پوری کائنات پر نظر ڈال کر فیصلہ کرے کہ یہ عالم کسی دست قدرت کی چابک دست طاقتوں کا نتیجہ ہے از خود پیدا نہیں ہوا بلکہ خدا تعالیٰ کی خلاّقیت کا کرشمہ ہے اور ان تمام چیزوں پر غور کرنے کے بعد حق اس پر واضح اور منکشف ہو جائے لیکن اگر کوئی شخص اپنے ان اعضاء سے کام نہیں لیتا، کان حق کو سنتے نہیں، آنکھیں آفاق و انفس پر غور نہیں کرتیں تو سمجھئے کہ اس کے ان اعضاء پر پردہ پڑا ہوا ہے اور وہ مقصد ان سے پورا نہ ہوا جس کے لئے وہ پیدا کیئے گئے تھے تو گویا کہ دل پر مہر، کانوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ کی صرف اتنی ہی حقیقت ہے کہ آدمی ان سے وہ کام نہ لے جو خدا تعالیٰ کے پیش نظر تھے، اگرچہ حقیقت میں یہاں نہ کوئی مہر اور نہ کوئی پردہ بلکہ تعطل اور ترک کا یہ ایک استعارہ ہے۔

ابن منصور کی اس توجیہ سے معلوم ہوا کہ کانوں پر مہر ہے جیسا کہ دلوں پر مہر ہے۔ نیز یہ آیت معتزلہ کے خلاف ایک دلیل ہے اور اہل سنت والجماعت کی ایک بڑی حجت ہے۔

خوفناک عذاب

ارشاد ہے کہ اس معاند گروہ پر خدا تعالیٰ کا شدید عذاب ہوگا۔ عذاب اور نکال وزن اور معنے کے اعتبار سے تقریباً ایک ہی مفہوم کی ادائیگی کرتے ہیں کیونکہ اعذب کے معنی بھی کسی چیز سے روکنے کے آتے ہیں جس طرح کہ یہی معنے "نکل" کے آتے ہیں، عظیم اور کبیر میں فرق ہے عظیم حقیر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور کبیر، صغیر کے مقابلہ میں استعمال ہے گویا کہ عظیم کبیر سے بڑھکر ہے جیسا کہ حقیر، صغیر سے بھی کمتر ہے۔ عظیم اور کبیر انسان کے جسم و جثہ اور معاملات وغیرہ دونوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ بڑا عظیم آدمی ہے پیش نظر اس کا جثہ ہوتا ہے "بڑی بات پیش آگئی" اب عظیم بات کی صفت ہے کسی شخص کے عظیم جثہ کا اظہار کرنے کے لئے نہیں آیا۔ غشاوہ نکرہ استعمال ہوا ہے یہ بتانے کے لئے کہ یہ پردہ جو آنکھوں پر پڑا ہے جس کو عام آدمی پہچان بھی نہیں سکتے یہ محسوس پردہ نہیں بلکہ ایک غیر محسوس پردہ ہے جو آیات اللہ کا انکار کا نتیجہ ہے۔ اور نیز جو عذاب ان کو دیا جائے گا وہ ایسا ہوگا کہ اس کو خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ○ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں چالبازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان

آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ○ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ

لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چالبازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں بڑا مرض ہے سو اور بھی بڑھا دیا

مَرَضًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ○

اللہ تعالیٰ نے اُن کا مرض اور اُن کیلئے سزائے دردناک ہے اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے

اور یہ گروہ منافقین

ارشاد ہے کہ کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر پورا پورا ایمان رکھتے ہیں حالانکہ ان کو ان دونوں باتوں پر ذرا سا بھی ایمان نہیں۔ ترتیب کی لطافت کی کہاں تک داد دیجیئے پہلے تو خدا تعالیٰ نے اس جماعت

کا ذکر فرمایا جو اللہ کے دین پر اخلاص کے ساتھ ایمان و یقین رکھتے ہیں اور جن کی زبانیں وہی کچھ کہتی ہیں جو ان کے دلوں میں ہے۔ اس کے بعد ان کا ذکر آیا جو کافر ہیں اور جن کے دل بھی منکر اور زبانیں بھی خوگر انکار، اور اس کے بعد اس گروہ کا ذکر کیا جو زبان سے تو ایمان کا اظہار کرتے ہیں حالانکہ ان کے دل ریب و انکار کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں، یہ منافقین ہیں اور کفر سے بھی ان کا نفاق گھناونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ "منافقین جہنم کے سب سے آخری درجہ میں ہوں گے"۔ اور وجہ ان کے جرم کے شدید ہونے کی یہ ہے کہ ان کے کفر میں دھوکہ اور استہزار کافر کے کفر سے زیادہ ہے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے سورہ بقرہ کے ابتدا میں چار آیات میں تو مومنین کا ذکر اور ان کی ممتاز صفات کا تذکرہ فرمایا اور دو آیات میں کفار کا ذکر ہوا اور تیرہ آیات منافقین سے متعلق آئیں جن میں ان کے نفاق پر بھرپور تنقید کی، ان کے خبث باطنی کو ظاہر کیا، ان کی حماقت و جہالت کو آشکارا کیا، ان کی سرکشی و نافرمانی کا اعلان فرمایا، ان کو اندھا بہرا اور گونگا ثابت کیا اور واضح مثالوں کے ساتھ ان کے نفاق کا بھانڈا پھوڑا۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ منافقین کا قصہ از اول تا آخر الذین کفروا پر عطف ہے جیسا کہ جملہ کا جملہ پر عطف ہوتا ہے۔ ناس اصل میں اناس تھا تخفیفاً اس کا ہمزہ حذف کر دیا گیا اور یوں سمجھئے کہ لام تعریف کے ساتھ اس ہمزہ کو حذف کرنا ضروری ہے "الاناس" کبھی نہیں کہا جائے گا اور اس کی اصل پر انسان، اناس، انس وغیرہ شہادت دیتے ہیں۔

انسان کو انسان اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ظاہر ہوتا ہے اور اس کو دیکھا جا سکتا ہے جیسا کہ "جن" کو اس لئے جن کہا جاتا ہے کہ وہ نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان کو دیکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ ناس فعال کے وزن پر ہے اسماء جمع میں سے ہے اور اس پر لام، لام جنس ہے "من" موصوفہ ہے اور "یقول" اس کی صفت ہے گویا کہ یوں عبارت بنی کہ "انسانوں میں سے بعض وہ ہیں جو یوں کہتے ہیں"۔

لطیفہ | منافقین نے اپنے دعویٰ ایمان میں دو چیزوں کا خاص طور پر ذکر کیا تھا ایک "ایمان باللہ" کا اور دوسرے "ایمان بالآخرت" کا، کیونکہ اعتقادیات کی ابتدا تو یہ ہے کہ انسان اس دنیا کے بنانے والے اور خالق پر ایمان رکھتا ہو اور انتہا یہ ہے کہ اس دنیا کے فنا ہونے آخرت کے قائم ہونے حشر و نشر، پل صراط، عالم برزخ کو مانتا ہو تو منافقین نے بڑی چالاکی سے عقائد کی ابتدا اور انتہا پر اپنا ایمان ظاہر کر کے گویا کہ اپنے لئے کامل ایمان کا دعویٰ کیا تھا۔ یوم آخر وہ وقت ہے جس کی کوئی حد نہیں کیونکہ ابد دائم وہ ہے جس کا سلسلہ کبھی منقطع ہی نہ ہو اور اس کو یوم آخر اس لئے کہتے ہیں کہ یہ مؤخر ہے یا حشر و نشر کا وہ متعین وقت ہے جبکہ اہل جنت بہشت میں اور جہنمی جہنم میں داخل ہو چکیں گے۔ اور اس پر بھی نظر رہے کہ الیوم الآخر پر بھی بار داخل کی اور آمنّا باللہ پر بھی باء کو داخل کیا ان دونوں پر باء کو داخل کر کے اس طرف اشارہ کرنا چاہتے تھے کہ ہر دو چیزوں پر ہمارا ایمان بالکل درست اور صحیح ہے۔ خدا تعالیٰ ان کے اس پر زور اور غلط دعویٰ کے جواب میں فرماتے ہیں کہ جھوٹے ہیں یہ ہرگز مومن نہیں۔ یہاں خدا تعالیٰ نے مومن کو فاعل کی صورت میں ذکر کیا فعل کی صورت میں ذکر نہیں کیا حالانکہ ان منافقین نے اپنے دعویٰ کو فعل کی صورت میں (آمنّا) ذکر کیا تھا تو مطابقت خدا تعالیٰ کے ردّ اور ان کے دعویٰ میں اس طرح ہوگی کہ خدا تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ان کے اس دعویٰ کی پوری قوت کے ساتھ تردید کریں اسی مقصد کے لئے فعل کی تردید فعل کے ساتھ نہیں بلکہ فاعل کے ساتھ کی ہے گویا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو مؤمنین کے زمرہ ہی سے نکال دیا۔

یہ ایسا ہے جیسے کہ خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر جہنمیوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ یریدون ان یخرجوا منہا وما ھم بخارجین کہ جہنمی جہنم سے نکلنا چاہیں گے اور حالانکہ وہ اس سے نکلنے والے نہیں کیونکہ وما ھم بخارجین۔ وما یخرجون منہا سے زیادہ بلیغ اور تاکید کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

پھر دوسرے موقع پر ایمان کو اول میں مقید کرنے کے بعد مطلق رکھا کیونکہ تقیید کو مراد لینے اور نہ لینے کا احتمال باقی رہے اس لئے کہ مذکور کی اس پر دلالت ہے اور یہ بھی ہے کہ دراصل تو نفی ایمان کی مقصود ہے اور اس کے ضمن میں مذکور کی بھی نفی ہو جائے۔ ان آیات کی ترتیب اور نظم و نسق سے "کرامیہ" کے اس دعویٰ کی خوب تردید ہوتی ہے کہ ایمان صرف زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے ایمان میں اس کے علاوہ اور کسی چیز

کی ضرورت نہیں" اور اس قول کی تردید اس لئے ہوتی ہے کہ اگر ایسا ہوتا یعنی ایمان میں صرف اقرار معتبر ہوتا اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی تو خدا تعالےٰ منافقین کے دعویٰ ایمان کو ہرگز غلط نہ قرار دیتا کیونکہ وہ تو زبانی طور پر ایمان کا مسلسل دعویٰ کر ہی رہے تھے۔

اور اہل سنت کے عقیدہ کی ان آیات سے تائید حاصل ہوتی ہے کیوں کہ ان کے یہاں ایمان میں زبان کا محض اقرار معتبر نہیں بلکہ اعضاء سے اس اقرار لسانی کی تصدیق بھی ضروری ہے (یہاں مصنف نے کچھ ترکیب نحوی سے حاصل ہونے والے فوائد دکھائے ہیں جو عوام کے کام کی چیز نہیں مترجم کا قلم اُن کو چھوڑتا ہے)

دھوکہ دینے کی فکر ارشاد ہے کہ ان منافقین کی دیدہ دلیری کی انتہا ہے کہ خدا تعالیٰ کو بھی دھوکہ دینے کی فکر کرتے ہیں۔ یہاں مفسرین کو بڑا اشکال یہ پیش آیا کہ بھلا خدا تعالےٰ جو علام الغیوب ہیں اور جن سے زمین و آسمان کی تمام کائنات کا کوئی بھی حال چھپا ہوا نہیں ہے ان کو اگر کوئی دھوکہ دینا چاہے تو کیسے دے سکتا ہے؟

پھر مفسرین نے خود ہی اس مشکل کو اس طرح حل کیا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں عبارت یوں تھی کہ یخادعون رسول اللہ کہ یہ خدا تعالیٰ کے رسول کو دھوکہ دیتے ہیں اور کیونکہ رسول ایک انسان ہیں اس لئے اُن کو دھوکہ دینا ممکن ہے۔ مفسرین نے اپنی اس تحقیق پر قرآن ہی سے ایک تائید بھی پیش کی ہے مثلاً انھوں نے کہا ہے کہ دیکھئے قرآن مجید میں ہے واسٔل القریۃ کہ "گاؤں سے پوچھو" ظاہر ہے کہ گاؤں سے پوچھنا تو بالکل ہی ممکن نہیں اس عبارت کو ٹھیک کرنے کیلئے "اہل" کا لفظ مقدر مانا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ عبارت یوں ہے کہ "گاؤں والوں سے پوچھو" تو جیسے اس آیت میں مضاف (اہل) محذوف ہے اسی طرح اس آیت میں بھی مضاف (رسول) محذوف ہے۔

گویا کہ خدا تعالیٰ نے اپنے رسول کا مقام اس قدر اونچا کر دیا کہ آپؐ کے دھوکہ دینے کو بھی خدا تعالیٰ کو دھوکہ دینے کے مترادف قرار دیا جیسا کہ ان الذین یبایعونك الخ والی آیت میں آپؐ کے دست گرامی پر بیعت کرنے والوں کو خدا تعالیٰ کے دست پاک پر بیعت کرنے کا مرادف قرار دیا۔ خداع کے معنی ہیں کہ دل میں تو کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کرے۔

اور بعض علماء یوں کہتے ہیں کہ مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ یہ احمق منافقین اپنی حماقت سے یوں سمجھتے ہیں کہ ہم خدا تعالیٰ کو بھی دھوکہ دے سکتے ہیں حالانکہ یہ ان کی حماقت ہے ورنہ خدائے علیم و علام کو دھوکہ دینا کس طرح ممکن ہے۔

(اب یہاں پر ایک اشکال اور یہ ہوتا ہے کہ "یخادعون" باب مفاعلت سے استعمال ہوتا ہے اور اس باب کی خصوصیت اشتراک ہے مثلاً آپ کہتے ہیں کہ فلاں صاحب سے میری مکاتبت ہے تو مطلب اس کا یہ ہوگا کہ میں ان کو خط لکھتا ہوں اور وہ مجھ کو لکھتے ہیں اس باب کی اس خصوصیت کی وجہ سے اشکال یہ پیش آرہا ہے کہ دھوکہ دینا تو قطعاً معیوب ہے اور اخلاقی نقطہ نظر سے اس کی تعریف تو کیا اجازت بھی نہیں دی جاسکتی ہے اور ایک مہذب سوسائٹی اور صالح معاشرہ میں ایسے شخص کا کوئی مقام نہیں جو دوسروں کو دھوکہ دیتا پھرتا ہو۔ پھر خدا تعالیٰ کے لئے کیسے مناسب اور زیبا ہے کہ وہ بھی دھوکہ دیں جو کہ "یخادعون" سے مفہوم ہے جواب اس کا یہ ہے کہ بعض مواقع پر باب مفاعلت کی یہ خصوصیت ترک کردی جاتی ہے مثلاً استعمال ہوتا ہے کہ عاقبت اللص میں نے چور کو سزا دی تو اب اگر یہاں باب مفاعلت کی خصوصیت کو سامنے رکھ کر یوں کہا جائے کہ چور نے مجھ کو سزا دی اور میں نے چور کو۔ تو ظاہر ہے کہ یہ معاملہ عقل کے قطعاً خلاف ہے اس لئے بات کو ٹھیک کرنے کے لئے کہنا پڑتا ہے کہ یہاں باب مفاعلت اپنے اشتراک والی خصوصیت پر قائم نہیں رہا۔ اسی طرح اس آیت میں مفاعلت کی یہ اشتراکی خصوصیت ختم ہوگی۔

"یخادعون" ترکیب نحوی کے اعتبار سے یا تو "یقول" کا بیان ہے یا جملہ مستانفہ ہے اور گویا کہ سیاق عبارت سے ایک سوال پیدا ہو رہا ہے جس کا یہ جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ منافقین خواہ مخواہ ایمان کا غلط دعویٰ کیوں کرتے ہیں اور اس سے ان کو کیا فائدہ؟ جواب اس کا یہ ہے کہ منافقین اپنے اس غلط دعویٰ سے خدا تعالےٰ کو فریب میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ ان کو کفار سمجھکر مسلمان اُن سے جہاد نہ کریں اس طرح اُن کی عزت و آبرو، جان و مال محفوظ رہے اور اگر مسلمانوں کو غنیمت حاصل ہو تو اس میں یہ بھی

شریک ہوں۔ یہی کچھ مقاصد ہیں جن کی وجہ سے یہ ایمان کا دعوی کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ اور صرف خدا تعالیٰ ہی کو نہیں بلکہ مومنین کو بھی دھوکہ دینے کی فکر کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی چال خود انھیں کے حق میں مضر ہے کیونکہ ان کے اس مذموم اقدام کا نقصان آخرت میں بصورت عذاب انھیں کو پہونچے گا تو ان کی مثال ایسی ہوتی ہے کہ کوئی شخص آگ سلگا رہا ہو جس سے خود اس کے گھر جلنے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہو اور وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ رہا ہو کہ یہ آگ دوسروں کو نقصان پہونچائے گی اور میں محفوظ رہوں گا، تو نقصان ظاہر ہے اپنا کر رہے ہیں اور حماقت کی انتہا ہے کہ اس سے واقف بھی نہیں ہیں۔

قرآن نے اس موقع پر شعور کا لفظ استعمال کیا ہے شعور کے معنی ہیں کسی چیز کو حواس سے معلوم کرنا یہ شعار سے ماخوذ ہے۔ شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو جسم سے ملا ہوا ہوتا ہے جیسا کہ بنیان وغیرہ۔ مشاعر الانسان انسان کے حواس خمسہ کے لئے استعمال ہوتا ہے کیونکہ یہی حواس خمسہ شعور کے آلات ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نفاق کے نتیجہ میں ان کو جو نقصان پہونچے گا وہ اتنا بدیہی اور محسوس ہے کہ اس سے غفلت کوئی احمق ہی کر سکتا ہے ورنہ تھوڑی سی سوجھ بوجھ والا بھی اس پہلو سے آنکھ کبھی بند نہیں کر سکتا۔

دلوں کے بیمار

فرماتے ہیں کہ اس نفاق کی اصل وجہ یہ ہے کہ منافقین کے دلوں میں شک اور تردد بھرا پڑا ہے کیونکہ شک کی حقیقت میں دو امر میں زبردست تردد ہے جس میں یک طرفہ رائے کوئی نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ منافق کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک بکری دو ریوڑ میں تقسیم ہو۔ اور مریض بھی موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے، نیز بیماری، صحت کے بالکل خلاف ہے جیسا کہ فساد صحت کے مقابل ہے اس لئے مرض کا ہر فساد شک، نفاق پر اطلاق کیا جا سکتا ہے اور نفاق، فساد قلبی کا نام ہے۔ ارشاد ہے کہ ایک تو ان کے دلوں میں یہ نفاق کی بیماری تھی ہی لیکن جب انھوں نے اس پر اصرار بھی کیا تو وہ بیماری بڑھتی ہی چلی گئی تو گویا کہ بیماری کے اسباب یعنی (نفاق پر اصرار) انھوں نے اختیار کئے اور قانون فطرت کے مطابق مسبّب اس پر خدا تعالیٰ نے مرتب فرمادیا لیکن کیونکہ اسباب اختیار انھوں نے کئے حالانکہ یہ اگر چاہتے تو نفاق وغیرہ کو چھوڑ سکتے تھے لیکن چھوڑنے کے بجائے برابر اس میں لگے رہے اور بڑھتے رہے اس لئے اس پر اُن کو خدا تعالیٰ شدید عذاب میں مبتلا فرمائے گا۔ اور یہ عذاب ایک تو اسی وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے نفاق اختیار کیا اور نیز اس وجہ سے بھی کہ انھوں نے ایمان کا غلط دعویٰ کیا گویا کہ یہ خدا تعالیٰ کو بھی فریب اور جل دینے کی جرأت کرتے تھے جو خود مستقل ایک جرم ہے جھوٹ کی حقیقت یہ ہے کہ واقعہ تو کچھ اور ہو لیکن اس کو ظاہر کسی اور رنگ میں کیا جائے تو گویا کہ یہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین اور شریعت، وحی اور قرآن کی تکذیب کرتے تھے! ورشاید یہ مبالغہ کا صیغہ ہو جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر صدق بطور مبالغہ استعمال ہوا ہے

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ○ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں یاد رکھو بیشک یہی

الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا

لوگ مفسد ہیں لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ تو

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا

کہتے ہیں کیا ہم ایمان لادیں گے جیسا ایمان لے آئے ہیں یہ بیوقوف یاد رکھو بیشک یہی ہیں بیوقوف لیکن اس کا علم نہیں رکھتے اور جب

لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ج وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ لا قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ لا

ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب خلوت میں پہونچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں ہم بیشک

اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○

ہم تو صرف استہزار کیا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ہی استہزار کر رہے ہیں اُن کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

یہ وہ لوگ ہیں کہ انھوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو سود مند نہ ہوئی اُن کو یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ

ان کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی سب چیزوں کو ایسی

تَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ۝ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْىٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝

حالت میں سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے اُن کی روشنی کو اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو اب یہ رجوع نہ ہونگے

اصلاح کے نام پر فساد فی الارض کی ناپاک کوششیں

ارشاد ہے کہ دیدہ دلیری کی انتہا ہے یا پھر ان کی حماقت کی کہ جب ان منافقین سے کہا جاتا ہے کہ اپنی مفسدانہ کوششوں سے دنیا کے امن و امان کو مت برباد کرو یہ نفاق کی پالیسی اس گہوارہ امن کے لئے ایک خوفناک فساد سے کم نہیں تو ظالم کہتے ہیں کہ واہ ہم کو مفسد کہا جا رہا ہے حالانکہ ہم تو اصلاح عام کا بیڑا اُٹھائے ہوئے ہیں۔

اور منافقین کا فساد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے راز جا کر کفار کو بتاتے اور کفار کے راز سے مسلمانوں کو مطلع کرتے اور مقصد اس سے ان کا یہ ہوتا کہ یہ دونوں جماعتیں (کفار اور مسلمان) آپس میں ایک دوسرے سے بھڑ جائیں اور اس طرح ان میں وہ خوفناک جنگ ہو کہ دنیا نے اس جیسی بربادی کبھی دیکھی نہ ہو کھیتیاں اُجڑ جائیں، ملک برباد ہو جائیں، آدمی کٹ مریں، عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جائیں۔ بھلا بتایئے کہ منافقین کی یہ کوشش کہ دنیا تہس نہس ہو جائے کیا فساد فی الارض نہیں تھی؟ یقیناً تھی اور بلا شبہ تھی۔ جواب میں کہتے کہ بوجی! ہم تو مسلمانوں اور کفار میں مصالحت کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں، چاہتے ہیں کہ یہ دونوں فرقے شیر و شکر ہو کر رہیں، اصلاح کا جو کام اور جس انداز پر ہم نے شروع کیا آج تک کسی کو اس کی توفیق نہیں ہوئی تھی اور اس کے باوجود ہم کو مفسد کہا جاتا ہے یہ بھی خوب رہی انما نحن مصلحون انما استعمال کر کے یہ ہی بتانا چاہتے تھے کہ اصلاحی اقدامات تو ہماری ہی خصوصیت ہے کہ کسی کو حاصل ہوئی نہ ہو گی اور یہ اس لئے کہ "انما" قصر حکم کے لئے آتا ہے تفصیلات معانی کی کتابوں میں مل جائیں گی۔

خدا تعالیٰ ان کو ان کی حماقت پر شدید تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خوب سن لو یہ مفسد ہیں اور حیرت ہے کہ ان کو اپنے اس مرض کا احساس بھی نہیں۔ گویا کہ خدا تعالیٰ نے ان کے اس غلط دعویٰ اصلاح پر اتنا مکمل رد کیا ہے جس کی داد نہیں دی جا سکتی کہ اول تو جملہ ہی مستانفہ اختیار فرمایا اور پھر "الا" کو ذکر کیا "انہم" میں خود مستقل تاکید ہے، خبر کو بصورت معرفہ ذکر کیا فصل بھی کیا اور ساتھ لا یشعرون بھی لائے ان تمام باتوں سے تردید مکمل ہو گئی

ایک اور حماقت لیجئے

ارشاد ہے کہ جب ان منافقین سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح اخلاص سے ایمان لے آؤ جیسا کہ دوسرے مخلص مسلمان ایمان لائے ہیں تو بجائے اس کے کہ اپنے نفاق پر محجوب اور شرمندہ ہوں کہتے ہیں کہ تو ہم سے احمق مسلمانوں کی طرح ایمان لانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے (بد نصیبوں کی نظر میں مخلص مسلمان احمق تھے والعیاذ باللہ) خدا تعالیٰ نے ان آیات میں دو طرح اُن کو نصیحت فرمائی تھی ایک تو یہ کہ تم جس طریقہ پر گامزن ہو وہ راہ راست نہیں کیونکہ وہ فساد فی الارض کی راہ اور حق و صواب سے مختلف راستہ ہے اور دوسرے ان کی خیر خواہی یہ فرمائی تھی کہ ان کو بتایا کہ تمہارے لئے وہ راستہ بہتر ہو گا جو مخلص مسلمانوں کا ہے۔ لیکن ان دونوں خیر خواہیوں کے نتیجہ اور جواب میں ان بد باطنوں کا بھی آپ نے جواب سن لیا اور خدا تعالیٰ نے ان کا یہ جواب نقل کر کے امت کے خیر خواہ طبقہ کی تسلی بھی فرما دی کہ تم کو دین کی اشاعت و تبلیغ کے سلسلہ میں ایسے احمقوں سے بھی سابقہ پڑیگا اور یہ دل خراش جملے بھی سننے ہوں گے۔

الناس میں لام متعین افراد کی طرف توجہ دلانے کے لئے تھا اور مراد آں حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخلص بعض صحابہ تھے رضوان اللہ علیہم اجمعین، یا حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ہم خیال تھے۔ گویا کہ عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھیوں کا نام لے کر اُن کو غیرت دلانا تھی کہ دیکھو تم ہی میں سے ہیں اور کس اخلاص کے ساتھ ایمان لائے، ایک تم کہ نفاق پر قائم اور فساد فی الارض کی مذموم کوششوں میں مبتلا ہو

اور ہوسکتا ہے کہ "الناس" پر لام جنس کا ہو اور مطلب یہ ہو کہ اے منافقین ان لوگوں کی طرح ایمان لاؤ جو انسانیت میں کامل ہیں گویا کہ جو ایمان لے آئے وہ خدا تعالیٰ کی نظر میں انسان ہیں اور جو ایمان سے محروم ہیں تو وہ یوں کہئے کہ بالکل چوپائے ہیں۔

"کما" میں جو کاف ہے وہ نصب کے موقع پر ہے کیونکہ مصدر محذوف کی صفت ہے اور مطلب یوں ہے کہ مومنین جیسا ایمان لائے اور یہی ترکیب و معنی کما امن السفہاء میں ہیں "انومن" میں ہمزہ استفہام انکار کے لئے ہے اور سفہاء میں جو لام ہے اس سے "الناس" کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ منافقین نے مومنین کو کیسے احمق کہہ دیا حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ مومنین کیسے عقلمند، دوراندیش اور معاملہ فہم ہیں پھر دیدہ و دانستہ کسی کو احمق کیسے کہا جاسکتا ہے جبکہ اس میں حماقت و دیوانگی کا شائبہ تک نہ ہو ادھر خود منافقین اتنے احمق نہیں کہ اچھے خاصے لوگوں کو احمق کہتے پھریں۔

حل اس اشکال کا یہ ہے کہ منافقین نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا کہ ہم جن عقائد پر قائم ہیں حق وہی ہے اور ہمارے عقائد کے خلاف جو کچھ ہے وہ غلط اور باطل ہے اور باطل کو اختیار کرنا حماقت ہے اس لئے مسلمان احمق ہیں (گویا کہ بنائے فاسد علی الفاسد) سفاہت کے لغوی معنی عقل کا خفیف ہونا، ہلکا ہونا آتے ہیں۔

خدا تعالےٰ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ احمق یہی ہیں لیکن ان کو اس کا علم نہیں۔

بلاغت و اعجاز قرآن کی ایک نادر مثال سنئے اور سر دھنئے، یہاں فرمایا کہ "جانتے تک نہیں" اور اس سے پہلے فرمایا تھا کہ "شعور تک نہیں" گویا کہ دونوں موقع پر ایک مضمون اور تعبیر اختیار نہیں کی گئی بلکہ ہر دو مواقع پر جدا جدا مفہوم و مضمون اختیار فرمایا اور یہ اس لئے کہ یہاں آخری موقع پر "سفاہت" کا ذکر آیا ہے سفاہت کا منشاء جہل ہوتا ہے اور جہل کے مقابلہ میں علم کا ذکر نہایت مناسب اور برمحل ہے اور نیز اس لئے بھی کہ ایمان غور و فکر، استدلال کا محتاج ہوتا ہے کہ انھیں کی روشنی میں ایک فکر و نظر کرنے والے کو راہ ملتی ہے اور رہا فساد فی الارض تو وہ بالکل محسوس چیز ہے اس لئے اس کو محسوس نہ کرنا شعور کے معطل اور فالج زدہ ہونے کی کھلی علامت ہے۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے سفہاء، ان کی خبر ہے "ہم" فصل کے لئے ہے یا مبتدا ہے اور سفہاء اس کی خبر ہے اور پھر یہ جملہ ان کی خبر بن جائے گا۔

بزدلی کا ایک مظاہرہ یا منافقانہ فریب کی بھیانک شکل

ارشاد ہے کہ یہ منافقین جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "لو بھئی ہم بھی ایمان لے آئے" قرآن شریف کی اس آیت میں "لقوا" ہے لیکن امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی روایت "لاقوا" بھی منقول ہے۔ قرارت کچھ بھی ہو لیکن عرب میں "لقیت" و "لاقیت" دونوں کا استعمال اس وقت ہوتا ہے جب کسی سے بالکل قریب ہو کر ملیں۔ اس لئے دونوں قراءتوں پڑھنے میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس سے پہلی آیت یعنی واذا قیل لھم میں تو خدا تعالیٰ نے منافقین کا طریقہ اور ان کے بیان کا کچھ بیان فرمایا تھا اور اس آیت میں منافقین کا وہ طرز عمل نقل فرمایا ہے جو وہ مومنین کے ساتھ جائز رکھتے تھے کہ مسلمانوں کا مذاق بنانے ان سے ملتے تو اسلام و ایمان کے نعرے بلند کرتے ہوئے اور ہر طریقہ پر جتاتے کہ مسلمان ہمارے متعلق یہی سمجھیں کہ ہم بھی مسلمان ہیں (گویا کہ یا تو یہ بزدلی کا مظاہرہ تھا کہ مسلمانوں کی شوکت سے دب کر ایسا کرتے یا فریب کاری کی وہی کوشش تھی جس میں ایک منافق ہمیشہ مبتلا رہتا ہے)۔

لیکن جب اپنے سرداروں کے پاس جمع ہوتے تو کہتے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم مسلمانوں کو جُل دے رہے تھے۔ لغت عرب کے اعتبار سے خلوت بفلان و خلوت الیہ اس وقت استعمال ہوتے ہیں جب آپ کسی کے ساتھ تنہائی میں جمع ہوں اور اگر "خلوت" الی کے ساتھ آئے تو پھر اس میں مبالغہ ہوتا ہے کیونکہ یہ جب الی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس میں ابتداء و انتہاء

دونوں پر دلالت ہوتی ہے گویا کہ اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ جب مومنین کے پاس سے نکل کر اپنے سرداروں کے پاس پہونچتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ "خلی" مضی کے معنی میں ہو۔ خدا تعالیٰ نے ان منافقین کے سربرآوردہ لوگوں کو شیاطین قرار دیا کیونکہ وہ اپنی سرکشی اور نافرمانی میں شیطان سے بالکل ملتے جلتے ہیں اور۔ یہ یہود اپنی مفسدانہ کوششوں کے اعتبار سے دنیا میں شیطان ہی کا کردار ادا کر رہے تھے۔ شیطان کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں سیبویہ کا خیال ہے کہ اس میں "نون" اصلی ہے کیونکہ عرب "تشیطن" استعمال کرتے ہیں اور اس میں نون حروف اصلی میں سے ہے، اور سیبویہ کی ایک دوسری رائے ہے کہ شیطان کا نون زائد ہے اور یہ "شطن" سے ماخوذ ہے جس کے معنی بعید ہو جانے کے ہیں کیونکہ شیطان خیر و فلاح سے محروم ہو گیا اس لئے اس کو شیطان کہتے ہیں۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ شاط سے مشتق ہو جس کے معنی باطل پرستی کے آتے ہیں اس معنے کے لئے ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ شیطان کا ایک مستقل نام "باطل" بھی ہے۔

بہر حال جب یہ منافقین ان شیاطین کے پاس جمع ہوتے ہیں تو ان سے بڑی رازداری کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے آدمی ہیں عقائد و افکار میں تمہارے متبع اور اعمال میں تمہارے قدم بقدم۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے تھوڑا سا آپ بھی غور کیجئے عجب لطف آئے گا کہ ان منافقین نے جب مسلمانوں سے گفتگو کی تھی تو جملہ فعلیہ استعمال کیا تھا یعنی "امنا"، اور جب اپنے سرکش سرداروں کے پاس جمع ہوئے تو ان سے جملہ اسمیہ میں گفتگو کی اور اس پر بھی مزید تاکید کے لئے "انا" داخل کیا یعنی "انا معکم" اور یہ سب کچھ اس لئے کہ مومنین کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے وہ ان کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ ہم اب ایمان لے آئے اگرچہ پہلے ایمان اختیار نہیں کیا تھا، اور اگرچہ بظاہر تو ان کا نفع اس میں تھا کہ وہ یہ دعویٰ کرتے کہ میاں ہم بڑے قدیم الاسلام ہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ ہمیشہ ہی سے مسلمان ہیں لیکن انھوں نے یہ اس وجہ سے نہیں کہا کہ اول تو اگر ایسا کہتے اور اپنے پرانے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تو خود مسلمان اس دعویٰ کو ہرگز تسلیم نہ کرتے۔ نیز نفسیاتی بات ہے کہ جو بات دل میں نہیں ہوتی اور زبان ایک خلاف واقعہ دعویٰ کی حمایت میں چلتی ہے تو چلتی تو ضرور ہے لیکن قدرتی طور پر اس بات میں ویسا زور نہیں ہوتا جو دل کی گہرائیوں سے نکلنے والی بات میں ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ مہاجرین و انصار جو ان کے دلی جذبات پر واقفانہ طور پر مطلع تھے ان کے سامنے ایسے مبالغہ کے ساتھ کوئی دعویٰ کر بھی کس طرح سکتے تھے، یہی کچھ وجوہات تھیں کہ ان کے جملے مسلمانوں کے سامنے اپنی ترکیب وغیرہ کے اعتبار سے ان جملوں سے قطعاً مختلف تھے جو وہ اپنے خاص لوگوں کے سامنے استعمال کرتے تھے، اپنے آدمیوں میں ان کی گفتگو پورے شوق، رغبت اور دلی جذبات کی آئینہ دار ہوتی تھی وہ وہاں جو کچھ کہتے اس کو تسلیم کرنے میں کوئی بھی پس و پیش نہ کرتا اس لئے وہاں جتنی موکد گفتگو کریں تو کوئی حرج نہیں، مبالغہ آرائی کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

کہتے تھے کہ ہم تو مسلمانوں سے یہ کہہ کر کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان کا مذاق بنا رہے تھے گویا کہ "انما نحن مستھزؤن" ان کے پہلے کلام یعنی انا معکم کی معنوی تاکید ہے، وہ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ہم یہودیت ہی پر قائم ہیں اور اسلام سے ہم کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ فطری بات ہے جو شخص کسی چیز کا مذاق اڑاتا ہے تو گویا کہ وہ اس کو حقیر سمجھتا ہے اور اس چیز کی اس کی نظر میں کوئی حقیقت و اہمیت نہیں اور اس کے مقابلہ میں کسی چیز کو اہمیت کے ساتھ ذکر کرنا اس چیز سے کامل وابستگی کا اعلان ہے تو اسلام کی حقارت اور یہودیت کی بلندی کے گویا کہ خود کو قائل ظاہر کرتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ مستانفہ ہو اور ایک اشکال کا جواب ہو یعنی جب انھوں نے اپنے سرداروں کے سامنے یہ دعویٰ کیا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تو انھوں نے ان سے کہا ہو کہ اگر بات یہ ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو تو پھر مسلمانوں سے تم کیوں موافقت کا اظہار کرتے ہو اور بعض معاملات میں ان کی زبانی حمایت کیا معنی رکھتی ہے؛ اس کا انھوں نے جواب دیا کہ ہیں تو درحقیقت ہم تمہارے ساتھ اور رہی مسلمانوں کی جزوی حمایت و موافقت تو وہ صرف ایک مذاق ہے اس کی کچھ اصلیت تھوڑی سی ہے۔ استہزاء کے معنی مذاق بنانا، کسی کو ہلکا سمجھنا ہیں اس مادہ میں ہلکا ہونے کا مفہوم موجود ہے کیونکہ "الھزء" کے معنے کسی کو تیزی سے قتل کر دینا کے آتے ہیں۔ عرب استعمال کرتے ہیں کہ ھزاء یھزاء یعنی فلاں شخص اپنی جگہ پر مر گیا۔

مسلمانوں سے اس مذاق کا خدا تعالیٰ کی طرف سے جواب :- ارشاد ہے کہ یہ منافقین جو مسلمانوں کے ساتھ اس طرح مذاق کرتے ہیں خدا تعالیٰ جواباً ان کے ساتھ مذاق کریگا اور وہ اس طرح کہ

ان کو ڈھیل دیتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں دراں حالیکہ حقیقت حال سے یہ قطعاً بے خبر ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مذاق بنانا تو کوئی اچھی بات نہیں اگر اچھا ہوتا تو منافقین کی اس روش پر اعتراض ہی کیا ہوتا پھر خدا تعالیٰ منافقین سے کیوں مذاق کریں گے اور اس مذاق کی صورت کیا ہوگی؟ اس کا حل بعض مفسرین نے تو یہ کیا کہ اس آیت کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ ان سے مذاق کریں گے کہ یہ تو خدا تعالیٰ کی شان سے قطعاً بعید ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی مذموم حرکت کی پوری پوری سزا دیگا گویا کہ جزا سے عمل کو اسی عمل کی شکل میں ذکر کردیا اور خود قرآن مجید ہی میں اس کی نظیر بھی ہے مثلاً ایک موقع پر ارشاد ہے کہ جزاء سیئۃ سیئۃ کہ برائی کا بدلہ برائی حالانکہ برائی کا بدلہ برائی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ جواب وہی ہے کہ محض مشاکلت کے قاعدہ سے برائی کے جواب کو برائی سے تعبیر کردیا۔ زجاج نے کہا کہ میرے خیال میں ان آیات کی تفسیر اس سے بہتر اور کوئی نہیں۔

نکتہ:- اللہ یستہزی بھم کو مستقل جملہ کی صورت میں ذکر کیا ما قبل پر اس کا عطف نہیں کیا جس سے ایک نئی لطافت اور ایسی ندرت پیدا ہوگئی جس کی داد نہیں دی جا سکتی۔ ندرت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ ان کو سمجھانا چاہتے ہیں کہ ہمارا مذاق تم سے مسلسل ہوتا رہے گا اور تمہاری اس حرکت کی پاداش میں جو عذاب اور عبرتناک سزا تم کو دی جائے گی کسی انقطاع کے بغیر چلے گی، عذاب وعقاب کے اسی تسلسل کے لئے اللہ یستہزی کہا گیا اللہ مستہزی نہیں کہا حالانکہ یہ تعبیر ان کے قول "انما نحن مستہزءون" کے ہموزن ہوتی

یہ گروہ منافقین:- ارشاد ہے کہ اس گروہ منافقین نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی کو اختیار کیا ہے ترکیب نحوی کے اعتبار سے "اولئک" مبتدا ہے اور ما بعد کا جملہ اس کی خبر، گویا کہ اس آیت میں اشتراء، اختیار و ترجیح کے معنی میں ہے اور یہ جو کہا گیا کہ انھوں نے ہدایت کو چھوڑ دیا اور اس کے مقابلے میں گمراہی اختیار کر لی تو ہدایت پر بظاہر وہ کبھی تھے ہی نہیں پھر چھوڑنے کا کیا سوال؟ جواب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی قوم میں تھے جنھوں نے پہلے ہدایت اختیار کی تھی اور اس کے بعد اس کو چھوڑ دیا تھا، یا ہو سکتا ہے کہ یہود مراد ہوں جو آپ کی بعثت سے پہلے آپ پر ایمان رکھتے تھے اور جب آپ نے اسلام کی طرف بلایا تو آپ کے منکر ہو گئے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ہدایت ان کے لئے اختیار کرنا بہت آسان تھا انھوں نے دیدہ و دانستہ اس کو ترک کیا۔

مسئلہ:- قرآن مجید کی انھیں آیات سے "تعاطی" کی صورت اور اس کا جواز مفہوم ہوتا ہے تعاطی کا مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی چیز خریدیں چیز دکاندار کے یہاں سے اٹھالیں، قیمت رکھدیں، نہ آپ بولیں اور نہ بیچنے والا لیکن اس کے باوجود خرید و فروخت صحیح ہو گی مثلاً ماچس کی قیمت طے ہے آپ جائیں دکاندار کے سامنے ماچس کی قیمت رکھدیں اور ماچس اٹھالیں نہ آپ بولیں اور نہ دکاندار تاہم یہ خرید و فروخت صحیح ہوگی۔ اور قرآن کی اس آیت سے اس مسئلہ کے جواز کی صورت اس طرح مفہوم ہوئی کہ منافقین نے شراء (خریداری) کا لفظ استعمال نہیں کیا لیکن اپنی مرضی اور پسندیدگی سے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کرلی ان کے اس عمل کو خدا تعالیٰ نے خرید و فروخت سے تعبیر کیا تو معلوم ہوا کہ "تعاطی" کی صورت جائز ہے لیکن اس میں اتنا ضروری ہے کہ فریقین یعنی خریدنے والا اور بیچنے والا دونوں راضی ہوں۔

ضلالت کا مطلب ہدایت کو چھوڑ دینا اور راہ راست سے منحرف ہو جانا ہے دین میں سیدھی راہ چھوڑ دینے کیلئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔

نقصان کی تجارت:- ارشاد ہے کہ لیکن منافقین کو اس سودے میں کہ ہدایت کو چھوڑ دیا اور گمراہی اختیار کرلی، نقصان ہی رہا۔ ربح کے معنی فائدہ کے ہیں اور تجارت تو آپ جانتے ہی ہیں۔ غور اس پر کیجئے کہ نفع کی اسناد تجارت کی طرف کردی حالانکہ تجارت نفع نہیں دیتی بلکہ نفع و نقصان تو خدا تعالیٰ ہی کے ہاتھ ہے ایسی اسناد کو اسناد مجازی کہتے ہیں جیسا کہ کہدیں "یہاں بارشوں نے فصل اگادی" تو ظاہر ہے کہ بارش سے فصل کیا اُگتی فصل کو اگانا تو خدا تعالیٰ ہی کے قدرت کا کرشمہ ہے مگر بارش کیونکہ سبب ہے اور سبب کی طرف بھی کبھی اسناد کر دیتے ہیں اور ان آیات میں اس طرح کی مجازی اسناد مسلسل ہوتی چلی گئیں پہلے تو اختیار ہدایت کو اشتراء سے تعبیر کیا کہ وہ بھی مجازی تھا اور پھر یہاں نفع کی اسناد اور تعلق تجارت سے قائم کر دیا کہ یہ بھی مجاز ہی کا ایک شعبہ ہے جیسا کہ شعراء ایک شعر میں کچھ چیزیں ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کے مناسب چیزیں بھی ذکر کرنا ضروری ہوتا ہے۔

پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ تجارت سے تو تاجر کا مقصود نفع حاصل کرنا ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ اصل سرمایہ جس سے اس نے تجارت شروع کی وہ بھی باقی رہے اور اس پر نفع حاصل ہو۔ سو اگر کوئی تاجر اپنا سرمایہ بھی ضائع کر دے تو اس سے زیادہ کوئی احمق نہیں اور اگر اصل سرمایہ تو بچائے لیکن اس کو نفع کچھ نہ ہو تو عقلمند اس کو بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اب ان منافقین کو لیجئے کہ ہدایت دے ڈالی اور اس کے عوض میں ایک ناقص چیز یعنی گمراہی خرید کر گھر لوٹے احمق ہیں، ناقص العقل ہیں کیونکہ گمراہ انسان کسی صورت میں بھی سود مند اور صاحب عقل نہیں قرار دیا جا سکتا اور اگر کچھ تھوڑے بہت دنیاوی مقاصد حاصل بھی ہو جائیں تو خدا اور اس کے رسول کی نظر میں ان دنیاوی منافع کی کوئی بھی اہمیت نہیں جو اس کو کوئی قابل قدر کام کہا جا سکے۔ بہر حال نہ ان کو تجارت کرنا آئی اور نہ ان کا عمل نافع اور فائدہ بخش رہا و ما کانوا مھتدین ترکیب نحوی کے اعتبار سے "الذین" اولٰئک کی صفت ہے اور "فما ربحت الخ" اولٰئک کی خبر ہے۔

ان منافقین کی ایک مثال:- خدا تعالیٰ منافقین کے کچھ عیوب ذکر فرما رہے تھے، ان کی بدعنوانیوں کو واضح طور پر سمجھانے کے لئے ایک مثال بھی ان کی حالت سے ملتی جلتی سنا رہے ہیں کیونکہ مثال سے ایک تو حقیقت خوب واضح ہو جاتی ہے اور دوسرے کوئی کتنا بعید الفہم مضمون ہو لیکن مثال سے قریب الفہم ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی مثال سے بات دل میں اس طرح اتر جاتی ہے کہ ہزار ہا تقریروں اور وضاحتوں سے بھی وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

آسمانی صحیفوں میں آپ مثالیں بکثرت پائیں گے یہاں تک کہ انجیل میں تو بعض سورتوں کا نام ہی اس طرح ہے کہ "سورۃ الامثال" "سورۃ المثل" وغیرہ۔ مثل کے معنی نظیر کے آتے ہیں، مثل، مثل، مثیل، شبہ، شبہ، شبیہ کی طرح استعمال ہوتے ہیں۔ پھر جو بات عوام میں بے حد رائج ہو جاتی ہے اس کو بھی مثال اور مثل وغیرہ کہنے لگے، ہاں اتنی بات ضرور پیش نظر رہتی ہے کہ مثال کسی ایسی ہی چیز کی ہوتی ہے جس میں کوئی ندرت یا عجوبگی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ پھر مثال کے الفاظ، نشست و برخاست، ترکیب وغیرہ کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ اس میں ذرا سا بھی تغیر نہ ہو۔ مثلاً اردو میں ہزار ہا مثالیں ہیں ان میں سے ایک مثال ہے کہ "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹے" تو اب اس کی نہ نشست و برخاست بدلی جا سکتی ہے اور نہ ترتیب مثلاً آپ بھاگوں کو مقدم کر دیں بلی کو مؤخر، یا بھاگوں کا مترادف استعمال کریں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، مثال کبھی حالت صفت اور قصہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتی ہے بشرطیکہ یہ حالت یا قصہ وغیرہ کسی عجیب و غریب چیز پر مشتمل ہو۔

اب اس تفصیل کو سامنے رکھ کر آیات مذکورہ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہے کہ ان منافقین کی حالت ان کی طرح ہے جنہوں نے آگ روشن کی اور جب وہ آگ خوب روشن ہو گئی تو خدا تعالیٰ نے اچانک اس کو بجھا دیا، گویا کہ یہاں لفظ مثل عجیب و غریب کے معنی میں آیا ہے چنانچہ قرآن شریف کی ایک دوسری آیت میں ہے کہ مثل الجنۃ التی وعد المتقون یعنی ہم نے آپ کو جو کچھ سنایا اس میں فردوس بریں کی داستان بالکل عجیب و غریب ہے اور اس کے بعد دور تک جنت سے متعلق وہ چیزیں ذکر کیں جن کو سن کر واقعی حیرت ہوتی ہے یا قرآن مجید میں ہے و للہ المثل الاعلیٰ یعنی خدا تعالیٰ کی شان و عظمت بالکل ہی عجیب ہے۔ ہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ الذی، الذین کے مقام پر استعمال ہو گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک اور موقع پر ایسا ہوا ہے یعنی خضتم کالذی خاضوا ایسے ہی یہاں بھی ہوا۔ اس تفصیل کے بعد اب یہ اشکال نہیں ہو سکتا کہ جماعت کو فرد واحد سے تشبیہ دی گئی جو غلط ہے۔ یا دوسری توجیہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ آگ روشن کرنے والے فرداً فرداً مراد نہیں بلکہ جماعت مراد ہے یعنی جنس مراد ہے افراد مراد نہیں۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ یہاں یہ اشکال ہونا ہی نہیں چاہیئے کیونکہ منافقین کو آگ روشن کرنے والے سے تشبیہ دینا ہی نہیں کہ اشکال ہو بلکہ منافقین کے قصہ کو ان آگ جلانے والوں کے قصہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بھی یاد رکھئے کہ "استوقد" اوقد کے معنی میں ہے وقود النار کے معنی آگ کے روشن کرنے کے آتے ہیں۔ آگ تو آپ جانتے ہی ہیں ہاں عربی میں اس کے لئے نار کا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے مادہ میں اضطراب و حرکت کا مفہوم موجود ہے۔

اضاءت کے معنی خوب اچھی طرح روشن ہو جانا یہ اضاءت ان آیات میں متعدی استعمال ہوا ہے اگرچہ اس کا بھی احتمال ہے کہ غیر متعدی ہو اور اس کی اسناد "ماحول" کی جانب ہو اور "اضاءت" تانیث کا صیغہ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ معنوی مناسبت پیش نظر

ہے کیونکہ آگ جلانے والے کے قرب وجوار میں جگہیں اور چیزیں ہیں اور فلما کا جواب آنے والی آیت یعنی ذھب اللہ بنورھم ہے یہ ظرف زمان ہے اور اس کا جواب اس میں عامل ہے جیسا کہ اذا و ما موصولہ وغیرہ حولہ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے یا نکرہ موصوفہ ہے اور ضمیر جو کبھی بصورت جمع لائی گئی اور کبھی واحد کی صورت میں تو وہ اس لئے کہ کبھی الفاظ پیش نظر رہے اور کبھی معنی، نور آگ کی روشنی کو کہتے ہیں اذھب کے معنی زائل کر دیا، ختم کر دیا وغیرہ۔ بہر حال معنی یہ ہو۔ کہ اچانک اس جلتی ہوئی آگ کو خدا تعالیٰ نے بجھا دیا اور جس کو وہ بجھا دیں تو پھر اسے روشن کرنے والا کون ہے۔

یہاں اگر یہ نکتہ سامنے رہے تو آپ کو خوب ہی لطف آئے وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے اس موقعہ پر یوں نہیں فرمایا کہ ذھب اللہ بضوئھم بلکہ اس کے بجائے ذھب اللہ بنورھم فرمایا کیونکہ نور میں زیادہ مبالغہ ہے اور اللہ تعالیٰ یوں سمجھانا چاہتے ہیں کہ آگ قطعاً ہی ختم کر دی گئی یہاں تک کہ ذرا سی بھی روشنی باقی نہیں رہی۔

اگر اس موقعہ پر ضوء کا لفظ استعمال فرماتے تو خیال ہوتا کہ روشنی جاتی رہی لیکن آگ باقی ہے اور نور کے لفظ نے بات ہی دوسری پیدا کر دی۔ یہی ہیں وہ نکات قرآنی جس کی نظیر پیش کرنے سے دوسری کتابیں قاصر ہیں اور چنانچہ اسی کی رعایت سے آگے فرما دیا گیا کہ آگ بجھا کر ان کو بالکل ہی تاریکی اور اندھیرے میں چھوڑ دیا۔

ایک گھٹا ٹوپ اندھیری :- ارشاد ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ نے ایک ایسی اندھیری میں مبتلا کر دیا کہ نہ وہ اس سے نکل سکتے ہیں اور نہ ان کو کچھ نظر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اس موقع پر ظلمات کو جمع اور نکرہ کی صورت میں ذکر کیا اور ساتھ ہی اس کے بعد لا یبصرون کا اضافہ فرمایا ان تمام چیزوں سے بتانا یہ مقصود ہے کہ وہ ایسی اندھیری اور گھٹا ٹوپ تاریکی ہے جس میں ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے بلکہ انسانوں کو خود اپنا وجود بھی نظر نہیں آتا، اندھیری، روشنی کے مخالف ایک کیفیت ہے جیسا کہ آپ جانتے ہی ہیں۔

اس پر غور کیجئے کہ خدا تعالیٰ نے منافقین کی حالت کو آگ روشن کرنے والوں کی حالت سے مشابہ قرار دیا ہے یہ اس لئے کہ روشنی ختم ہو جانے کے بعد جس طرح وہ لوگ جنھوں نے روشنی حاصل کرنے کے لئے آگ روشن کی تھی اندھیری اور تاریکی میں کھڑے رہ جاتے ہیں یہی کچھ حال منافقین کا ہے کہ انھوں نے بظاہر اسلام و ایمان قبول کیا تھا تو تھوڑی سی روشنی ان کو اس سے حاصل ہوئی لیکن کیونکہ نفاق کی ظلمت بعد میں چلی آ رہی تھی اس کے نتیجہ میں ایمان کا نور ختم ہو گیا اور دائمی کفر کی سیاہی و تاریکی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ گئی۔

ان آیات کی اس تفسیر و تشریح کے علاوہ ایک اور بھی تفسیر کی گئی ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ذکر فرمایا تھا کہ یہ منافقین وہ احمق ہیں جنھوں نے ہدایت کو دے کر اس کے عوض میں گمراہی کو خرید لیا ہے۔ تو اس مضمون کی مزید وضاحت کے لئے یہ مثال بھی سامنے رکھی کہ ہدایت جس کو انھوں نے اپنے ہاتھ سے دیا وہ ایک ایسا نور تھا جس سے پورا ماحول منوّر اور روشن ہو گیا تھا اور جو گمراہی انھوں نے اس کے عوض میں خریدی وہ ایک ایسی اندھیری اور ظلمت ہے جس نے روشن ماحول کو ایک گھٹا ٹوپ اندھیری میں بدل کر رکھ دیا شروع آیت میں نار کو نکرہ کی صورت میں ذکر کیا ہے جس سے اس آگ کی عظمت کی طرف توجہ دلانا ہے۔

اندھے ہیں، بہرے ہیں، گونگے ہیں :- ارشاد ہے کہ بس یوں سمجھو کہ یہ منافق اندھے ہیں، بہرے ہیں، گونگے ہیں۔ بظاہر اگرچہ وہ بینا تھے اندھے نہ تھے، کان ان کے تھے سنتے تھے سب کچھ بہرے ہرگز نہ تھے، منہ میں زبان تھی بولتے تھے اور خوب بکواس کرتے تھے گونگے نہ تھے پھر خدا تعالیٰ نے ان کو جو اندھا، گونگا اور بہرا قرار دیا تو وہ صرف اس لئے کہ انھوں نے اپنے ان اعضاء سے وہ کام نہیں لیا جو لینا چاہیئے تھا۔ آنکھوں سے کائنات میں دیکھنا چاہیے تھا اور اس پھیلی ہوئی دنیا کے خالق کو معلوم کرنا چاہیئے تھا زبان سے حق کا اظہار اور کانوں سے حق ہی کو سننا ضروری تھا لیکن جب انھوں نے یہ کام نہیں لیا تو گویا کہ یہ اعضاء ان کے پاس ہی نہ تھے [1]۔

[1] گویا کہ خدا تعالیٰ کی نظر میں ہر چیز کو اس کے مصرف میں لگانا ہی..... اس چیز کے مقصد پورا کرنے کے ہم معنے ہیں۔ ایک شخص کے پاس مال و دولت ہے (باقی بر صفحہ ۳۷)

علم معانی وبیان میں جس طرح بہادروں کو شیر اور سخی کو دریا سے تشبیہ دیتے ہیں مگر اتنا فرق ضرور رہتا ہے کہ یہ تشبیہات صفات میں چلتی ہیں اور یہاں جو کچھ ہے اس کا تعلق اسمار سے ہے اور نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس آیت میں استعارہ نہیں بلکہ تشبیہ ہے کیونکہ اس آیت میں مستعار لہ یعنی منافقین کا ذکر موجود ہے حالانکہ استعارہ میں ضروری ہے کہ مستعار لہ مذکور نہ ہو اور دلالت حال یعنی سیاق وسباق میں کوئی قرینہ نہ ہونے کی صورت میں منقول عنہ اور منقول الیہ دونوں مراد لے سکتے ہوں۔

اب کوئی امید نہیں:۔ ارشاد ہے کہ جب ان کا یہ حال ہے تو اب اس گمراہی سے ہدایت کی طرف آنا ممکن نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ روشنی کے زائل ہو جانے کے بعد جو اندھیری ان کے چاروں طرف پھیل گئی اس سے ان کا نکلنا مشکل ہے گویا کہ نہ جائے رفتن اور نہ پائے ماندن اس لئے ان کی ہدایت کی توقع ہی بیکار ہے۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِيٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ

یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے بارش ہو آسمان کی طرف سے جس میں اندھیری بھی ہو اور رعد و برق بھی ہو جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں

الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِينَ ۝ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۭ

اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشۂ موت سے اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لئے ہوئے ہیں کافروں کو برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آنکھ بینائی اُن کی

كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيهِ ۙ وَإِذَآ أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ

جہاں ذرا اُن کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کیا اور جب اُن پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو اُن کے

بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۭ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

گوش وچشم سب سلب کر لیتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر قادر ہیں

ایک اور مثال:۔ منافقین کے نفاق اور دورخی کو مزید وضاحت وتفصیل کے ساتھ سمجھانے کے لئے یہ ایک دوسری مثال پیش فرمارہے ہیں، پہلی مثال میں منافق کو ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی تھی جس نے آگ جلائی اور جو اس نے ایمان کا اظہار کیا تھا اس کی مثال، ماحول کے روشن اور منور ہونے سے دی لیکن نفاق کی وجہ سے بظاہر اسلام کا بھی جو فائدہ ختم ہوا اس کو آگ بجھ جانے کے مشابہ قرار دیا گیا اس دوسری مثال میں اسلام کو ایک بارش سے تشبیہ دی ہے جس طرح بارش سے زمین سرسبز وشاداب ہو جاتی ہے اسی طرح اسلام سے دلوں کی زمین زرخیز وزرریز بنتی ہے اور اس کا کفار کے ساتھ جو معاملہ ہوتا ہے اس کو ظلمت اور اندھیری کے مشابہ بتایا ہے، اسلام میں کفار کے لئے جو ڈانٹ ڈپٹ ہے اور ایسے ہی کفار کو جو مسلمانوں سے کفر کی بنا پر مصائب اٹھانا پڑتے ہیں ان کو رعد و برق وغیرہ سے تشبیہ دیگئی ہے۔

او کصیب سے پہلے لفظ مثل محذوف ہے کیونکہ عطف ما قبل کی آیت پر اس لفظ "مثل" سے دلالت کر رہا تھا اس لئے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی اور یہاں کسی شخص واحد کا حال بتانا مقصود نہیں بلکہ کفار کا حال ذکر ہو رہا ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید لفظ یجعلون سے ہوتی ہے کیونکہ وہ جمع کا صیغہ ہے اگر شخص واحد کا حال بیان کرنا پیش نظر ہوتا تو جمع کا صیغہ استعمال نہ ہوتا۔

حاصل یہ نکلا کہ منافقین کا حال ایسا ہے جیسا کہ موسلا دھار بارش میں ایک جماعت کھڑی ہو اور اس طوفانی بارش کی وجہ سے سینکڑوں آفات اس جماعت کے لئے پیدا ہوگئی ہوں، گویا کہ جماعت کو جماعت سے تشبیہ دی گئی ہے ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ مشبہات

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶) لیکن اگر وہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتا تو اس کو مالدار نہیں بلکہ مفلس کہنا چاہیئے جس کو شجاعت اور جسمانی طاقت حاصل ہے اگر وہ اس کو اسلام کی سربلندی کیلئے خرچ نہیں کرتا تو وہ طاقتور نہیں بلکہ بزدل اور کمزور ہے۔ عالم اگر اپنے علم سے فائدہ نہیں پہونچا رہا ہے تو وہ عالم نہیں جاہل ہے، خوب سمجھ لو کہ مرد وہ ہے جو اپنی طاقت اپنی بیوی اور جائز محل ہی میں صرف کرتا ہے وہ مرد نہیں جس نے اپنی طاقت کا صرف حرام محل بنایا ہو کہیں ہماری اس تقریر سے کوئی غلط شبہ

کا تذکرہ نہیں جیسا کہ ما یستوی الاعمیٰ و البصیر یا والذین امنوا وعملوا بالصالحات میں مشبہات کا ذکر موجود ہے یا عرب کے مشہور شاعر امرء القیس کے اشعار میں ذکر موجود ہے۔ قرآن مجید نے اس موقعہ پر مشبہات کا ذکر چھوڑ کر استعارہ کے طور پر اس کو استعمال کیا ہے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ دونوں مثالیں "مرکب مثال" کی صورت میں ہیں غیر مرکب مثال کی شکل میں نہیں۔ تفصیل اس موقع کی یہ ہے کہ عرب کا دستور ہے کہ وہ کچھ چیزوں کو اس طرح لیتے ہیں کہ باقی چیزوں سے ان کو جدا کر لیتے ہیں اس طرح کہ یہ بعض چیزیں دوسری چیزوں کے لئے مانع نہیں ہوتیں۔ اور مجموعہ اشیاء سے جو ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے تشبیہ اسی سے دینا مقصود ہوتی ہے مثلاً خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا الخ اب اس آیت میں یہودیوں کی جہالت اور تورات سے ناواقفیت کو گدھے کی اس حالت سے تشبیہ دی گئی ہے کہ اس پر جس چیز کا بوجھ لدا ہوا ہوتا ہے اس کا اس کو قطعاً علم نہیں ہوتا وہ نہیں جانتا کہ مجھ پر علم کے خزانے بار ہیں یا خس و خاشاک کے انبار۔

یا ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ واضرب لھم مثل الحیاۃ الدنیا کماء انزلناہ من السماء اب اس آیت میں دنیاوی ترقیوں، راحتوں اور آسائشوں کو فانی ہونے میں اس ترو تازگی سے تشبیہ دی گئی ہے جسے بہرحال خزاں کے جھکڑ ایک نہ ایک دن کوڑا کرکٹ کر کے چھوڑیں گے تو..... یہاں کیفیت کو کیفیت سے تشبیہ دی گئی ہے۔

پس جب خدا تعالیٰ نے منافقین کے متعلق یہ بیان فرمایا کہ وہ گمراہی میں مبتلا ہیں اور حیرت و دہشت میں پڑے ہوئے ہیں تو ان کی اس حیرت و مرعوبیت کو اس منظر سے تشبیہ دی گئی ہے جبکہ کسی آدمی نے رات کے سناٹے میں آگ جلائی تھی کہ اس کی روشنی میں دیکھے گا بھالے گا لیکن آگ اچانک بجھ گئی اور اندھیری میں وہ ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جائے۔

یا ایک ایسے شخص سے تشبیہ دی جو اندھیری رات میں یکہ و تنہا کھڑا ہو، موسلا دھار بارش پڑ رہی ہے، بجلیاں کوند رہی ہیں اور ساتھ ہی کڑک کی زہرہ گداز آوازیں۔ اس خوفناک منظر میں جس طرح یہ شخص گھبرایا ہوا، سہما ہوا، مرعوب و متحیر ہوتا ہے اسی طرح منافقین کا حال ہے کہ حیرت زدہ کھڑے ہیں نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔

ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ دوسری تشبیہ پہلی تشبیہ سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ دوسری تشبیہ سے حیرت اور منظر کی ہولناکی کا زیادہ اظہار ہوتا ہے اور ایک مثال کا جو دوسری مثال پر عطف کیا گیا ہے وہ مساوات کے لئے ہے جیسا کہ آپ کہہ دیں کہ "میاں جہاں جی چاہے بیٹھو خواہ حسن کے ساتھ یا ابن سیرین کے پاس" تو اس جملہ میں جس طرح ابن سیرین اور حسن کے پاس بیٹھنے کو مساوی قرار دیا ایسے ہی قرآن کی ان دونوں مثالوں میں مساوات ہے۔

یا جیسا کہ قرآن شریف میں ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے کہ آپ آثم (گنہ گار) اور کافر دونوں کی اطاعت نہ کیجئے مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کے ساتھ بیٹھنا بہرحال نافرمانی شمار ہوگا۔ اسی طرح ان دونوں مثالوں میں بھی مساوات مراد ہے۔

مراد یہ ہے کہ یہ دونوں مثالیں منافقین کی حالت پر چسپاں ہیں خواہ دونوں کو بیک وقت منطبق کیجئے یا علیحدہ علیحدہ۔ صیب زور سے برسنے والی بارش کو کہتے ہیں اگرچہ سحاب کو بھی صیب کہتے ہیں۔ صیب کو نکرہ بارش کی ایک شدید اور ہولناک نوعیت پر دلالت کرنے کے لئے استعمال کیا ہے جیسا کہ پہلی مثال میں نار کو نکرہ اسی مقصد کے لئے استعمال کیا تھا اور آسمان یہی "حد نگاہ" ہے جو ہم کو اور آپ کو نظر آ رہا ہے۔

حسن آسمان کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ "موج مکفوف" ہے یہاں یہ بات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہے کہ بارش کے ساتھ بظاہر آسمان کے ذکر کی ہرگز ضرورت نہ تھی کیونکہ بارش تو آسمان ہی سے پڑتی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ ایک خاص آسمان سے اس بارش کے اترنے کا ذکر...... ہے ورنہ ویسے تو آفاق کے گرد تمام ہی حصوں کو سماء کہتے ہیں جیسا کہ ہم نے بتایا تھا کہ صیب کی تنکیر سے بھی اسی طرح کے کچھ مقاصد وابستہ تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بادل آسمان سے اترتے ہیں اور اسی آسمان سے پانی حاصل کرتے ہیں اگرچہ

بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ بادل سمندر سے پانی لیتے ہیں اور پھر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں۔
رعد کے متعلق بعض آدمی تو یوں کہتے ہیں کہ بادلوں کے باہمی ٹکرانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو رعد کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ رعد اس فرشتہ کا نام ہے جو بادلوں پر مسلط ہے اور ان کو ادھر ادھر چلاتا ہے اور برق وہ بجلیاں ہیں جو بادل سے نکلتی ہیں۔ برق کے معنی چمک دار چیز کے آتے ہیں۔

یجعلون اصابعھم فی اذانھم کی ضمیر ان لوگوں کی طرف راجع ہے جو موسلا دھار بارش میں کھڑے ہوئے تھے اگرچہ

کانوں میں انگلیاں:- یہاں ان کا ذکر نہیں ہوا تاہم مراد وہی ہیں کیونکہ محذوف اگرچہ لفظوں میں محذوف ہوتا ہے لیکن معناً بہرحال مراد رہتا ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے اس "یجعلون" کا کوئی محل نہیں کیونکہ یہاں سے بات شروع ہو رہی ہے اس سے پہلے رعد و برق کا کچھ اس طرح ذکر آیا تھا جس سے اس خوفناک اور جاں گداز منظر کی کچھ تصویر کشی ہوتی تھی تو اب ایک سننے والے اور پڑھنے والے کے ذہن میں بے اختیار یہ سوال ابھرتا ہے کہ ایسی کڑک جس سے آدمی کی روح تحلیل ہوئی جاتی ہے اس میں وہ کیا کر رہے ہوں گے؟..
اسی کا قرآن نے جواب دیا کہ اس زہرہ گداز کڑک میں وہ اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں داخل کر لیتے تھے۔
اور یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ چکا چوند کرنے والی بجلیاں جب کوندتی ہوں گی تو اس وقت وہ کیا کر رہے ہوں گے؟ اس کا جواب دیا کہ مضطرب بجلیاں ان کی آنکھوں کی روشنی ختم کرنے کے لئے بے چین ہیں، یہاں یہ چیز توجہ کی مستحق ہے کہ کان میں زیادہ سے زیادہ انگلیوں کے اگلے حصے (یعنی پوروے) گھسائے جاتے ہیں انگلیاں تو کہیں بھی نہیں داخل کی جاتیں پھر قرآن مجید نے ایک غیر واقعی چیز کو کیوں ذکر کیا۔
جواب اس کے دو ہیں ایک تو یہ کہ اس میں کچھ توسع سے کام لیا ہے جیسا کہ چور کی شرعی سزا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کے "ہاتھ کاٹ دو"، حالانکہ سب ہی جانتے ہیں کہ حد شرعی میں چور کے ہاتھ تمام نہیں کاٹے جاتے زیادہ سے زیادہ پہونچوں تک کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ صورت حال کی خوفناکی اور بارش والوں پر اس کا خطرناک تاثر جس حالت میں مسلط تھا اس کی منظر کشی فرما رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ کڑک کی زہرہ گداز چیخوں سے تھرا کر چاہتے ہیں کہ انگلیاں ہی بجائے پوروں کے کانوں میں ٹھونس لیں۔
اور یہ لطیفہ بھی آپ کی نظر سے رہ نہ جائے کہ یہاں خاص انگلی کا ذکر نہیں فرمایا جو کان میں داخل کی جاتی ہے (یعنی انگشت شہادت) وجہ اس کی یہ ہے کہ عربی میں اس انگلی کے لئے سبّابہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہ سبّابہ سبّ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ذرا اچھے نہیں اور یہ قرآن مجید کا کمال ہے کہ ان الفاظ کے استعمال سے بھی احتیاط کی جن کا مفہوم کچھ ستھرا نہیں، ہاں بعد میں اس انگشت شہادت کے لئے مسبّحہ کا لفظ بھی استعمال میں ہے لیکن قرآن مجید نے اس کو اس لئے اختیار نہیں کیا کہ یہ ایک غیر مشہور لفظ ہے۔ ارشاد ہے کہ یہ انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک سے گھبرا کر داخل کر رہے ہیں۔
صاعقہ کڑک کا وہ آتشیں ٹکڑا ہے جو اس سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔
اگرچہ یہ ایک لطیف آگ ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود جب کسی چیز پر پڑ جاتی ہے تو اس کو خاکستر کر کے چھوڑتی ہے مگر آتشیں مادہ ہونے کے باوجود ختم بہت جلدی ہو جاتی ہے۔
بعض لوگوں نے چشم دید واقعہ ذکر کیا کہ کڑک ایک کھجور کے درخت پر گری تو آناً فاناً میں آدھا حصہ درخت کا جل گیا اور اس کے بعد خود وہ بھی ختم ہو گئی۔
اہل عرب صعقت الصاعقۃ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص کڑک یا اس کی ہولناک آواز کے صدمہ سے یا اس کے آتشیں مادہ سے ہلاک ہو جائے۔
ارشاد ہے کہ موسلا دھار بارش میں چلنے والی یہ جماعت جو اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لیتی ہے یہ سب کچھ موت کے

خطرے کی وجہ سے، موت جسم انسانی کی ساخت کے ٹوٹ پھوٹ جانے کا نام ہے۔ یا یوں کہئے کہ موت ایک ایسی کیفیت ہے جس کے طاری ہونے کے بعد وہ احساس، ادراک اور شعور باقی نہیں رہتا جو زندگی اور حیات کے خواص میں سے ہے۔

فرماتے ہیں کہ احمق ان تدابیری کوششوں کو اختیار کرنے کے بعد سمجھتے ہیں کہ آفات سے محفوظ رہ جائیں گے حالانکہ یہ غلط ہے کیونکہ خدا تعالیٰ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے واللہ محیط بالکافرین جیسا کہ ایک احاطہ کرنے والی چیز اس چیز کو جس کا اس نے احاطہ کیا ہو پورے طریقہ پر اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہوتی ہے اسی طرح یہ خدا تعالیٰ کے قابو میں اس طرح ہیں کہ نکلنا چاہیں بھی تو نہیں نکل سکتے۔ گویا کہ خدا تعالیٰ نے اس موقعہ پر یہ تعبیر اختیار فرما کر اپنے مکمل غلبہ کا اظہار فرما دیا ہے۔

ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ جملہ معترضہ ہے لہذا اس کا کوئی محل اعراب نہیں ہے۔

کوندتی بجلیاں :-

ارشاد ہے کہ اُدھر تو یہ احمق ان کمزور اور بے معنی کوششوں میں مبتلا ہیں دوسری طرف قہر آگیں بجلیاں ان کے سروں پر کوندھ رہی ہیں قریب ہے کہ یہ بے چین اور سیماب وار برق ان کی بصارت کو چھین کرلے جائے۔

قرآن مجید نے اس موقعہ پر خطف کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ عربی لغت کے اعتبار سے اس کے معنے کسی چیز کو تیزی کے ساتھ اُچک لینا ہیں اور کاد جیسا کہ معلوم ہے فعل کو قریب تر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یخطف محل نصب میں ہے کیونکہ کاد کی خبر ہے۔

ارشاد ہے کہ جب بجلیاں اُفق میں کوندتی ہیں تو یہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب پھر اندھیری پھیل جاتی ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کلما میں کل ظرف کے لئے ہے اور ما نکرہ موصوفہ ہے اس مرکب لفظ کے معنے وقت کے آتے ہیں عائد محذوف ہے اس پوری ترکیب کے معنی یہ بنے کہ جب ان کے لئے روشنی نمودار ہوتی ہے اور عامل اس میں اس کا جواب ہے اور وہ جواب قرآن مجید کی اگلی آیت یعنی مشوا فیہ ہے گویا کہ یہاں سے تیسری مرتبہ نیا سلسلہ گفتگو شروع ہوا ہے۔

گویا کہ سوال یہاں پیدا ہوتا تھا کہ جب منظر یہ تھا کہ کبھی بجلیاں کوندتی تھیں جس سے ایک جلد ختم ہو جانے والی روشنی سامنے آجاتی اور معاً اس کے بعد اندھیرا اور گھٹا ٹوپ اندھیری تو ایسے میں وہ کیا کرتے ہوں گے؟

اس کا جواب ہے کہ روشنی ہوتی تو چل پڑتے، اندھیرا ہو جاتا تو پھر حیران و پریشان۔ گویا کہ اس تمثیل میں بھی منافقین ہی کی حالت کی منظر کشی کی ہے۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ جس طرح بارش کے اس بلا خیز اور طوفان ریز سلسلہ میں یہ جماعت پریشان و ناگفتہ بہ حالت میں مبتلا ہے بالکل اسی طرح منافقین بھی اسلام کے بارے میں گو مگو کی حالت میں ہیں۔ جو دین برحق ان کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس کی صداقت اور سچائی سے ناواقف ہیں۔

اسلام کی روشنی، ایمان کی نور جب سامنے آتی ہے تو چند قدم چل کھڑے ہوتے ہیں اور جیسے ہی کفر و شرک کی ظلمت کالے بادل کی طرح سر پر محیط ہو جاتی ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔

عربی میں انسان کے چلنے کے لئے مشی اور اگر تیز رفتاری ہے تو سعی اور دوڑنے کے لئے عدو کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

بلاغت قرآن
ارشاد ہے کہ جب اندھیری ہو جاتی ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں. قرآن مجید نے اس موقع پر اظلم کا صیغہ استعمال کیا ہے. جو کہ متعدی ہے. لطف یہ ہے کہ اضاء کیساتھ کلما استعمال کیا گیا تھا اور اظلم کے ساتھ اذا استعمال ہوا ہے اور یہ فرق اس لئے ملحوظ رہا کہ اس طوفانی بارش میں چلنے والی جماعت کو جو کچھ مصیبت پیش آتی اس سے وہ فوراً ایک منٹ کا توقف کئے بغیر نکل جانا چاہتے ہیں تو جب بھی ذرا سی روشنی ٹمٹاتی ہے چل پڑتے ہیں اور جب اندھیری چھا جاتی ہے تو توقف قطعاً جبری اور غیر اختیاری ہوتا ہے. کلما مصیبت سے نجات اور گلو خلاصی کی کوششوں کے مسلسل ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اذا غیر ارادی ٹھہرنے پر علامت ہے قاموا. کے معنے ٹھہر جانے اور اپنی جگہ پر کھڑے رہ جانے کے ہیں، عرب استعمال کرتے ہیں قام الماء، پانی کھڑا ہو گیا یعنی اس کے لئے نکلنے کی جگہ باقی نہیں رہی۔

فرماتے ہیں کہ شاید یہ جماعت اپنی ان کوششوں کو قطعی اور حتمی علاج سمجھ رہی ہو. اس مصیبت سے رہائی کے لئے جو قدرتی طور پر ان کو پیش آ رہی ہے حالانکہ ان کا یہ خیال غلط ہے اگر خدا تعالیٰ چاہیں تو کڑک کی زہرہ گداز آوازوں سے ان کے کان کے پردے پھاڑیں اور بجلیوں کی چکاچوند کر دینے والی روشنی سے ان آنکھوں کو خیرہ کر دیں، اور ان کی یہ کوششیں تمام کی تمام ناکام ہو کر رہ جائیں، ترکیب نحوی کے اعتبار سے، شاء کا مفعول محذوف ہے. کیونکہ جواب، اس مفعول محذوف پر خود ہی دلالت کر رہا ہے. اس لئے ذکر کی ضرورت نہیں اور مقدر عبارت کو سامنے رکھنے کے بعد ترجمہ اور مطلب بلکہ پوری عبارت یوں بنتی ہے کہ "اگر خدا تعالیٰ ان کی قوت سامعہ اور بینائی کو ختم کرنا چاہیں تو بخوبی کر سکتے ہیں"، عربی اسلوب کے اندر، شاء اور اراد کے مفعول کو حذف کرنے کا بکثرت قاعدہ ہے، ہر ہر جگہ حذف کر دیتے ہیں الا یہ کہ کوئی مقام ایسا ہو کہ وہاں مفعول نہایت ہی نادر الوقوع ہو اور اس کے ذکر نہ کرنے سے مخاطب کا ذہن ادھر متوجہ ہی نہ ہو تو ذکر کر دیتے ہیں جیسا کہ عربی کے ایک شاعر نے کہا ہے۔

فلو شئت ان ابکی دماً لبکیتہ علیہ ولکن ساحۃ الصبر اوسع

اب اس شعر میں "شئت" کا مفعول دماً ذکر کر دیا گیا. کیونکہ خون کے آنسو رونا ایک نادر بات ہے شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ محبوب کے فراق میں یا اس کے مظالم سے تنگ آ کر، اگر میں خون کے آنسو رونا چاہتا تو رو سکتا تھا لیکن (اس امر سے مانع یہ ہے کہ صبر کی جولانگاہ بہت وسیع ہے (اور میں ہر ہر مصیبت پر صبر کر لیتا ہوں)

ارشاد ہے کہ ہم نے یہ جو کچھ کہا کہ ہم ان کی بینائی اور سننے کی طاقت کو ضائع کر سکتے ہیں اسکو صرف ایک دھمکی نہ سمجھنا بلکہ یقین رکھو یہ معاملہ اگر ہم کرنا چاہیں تو ہماری قدرت میں ہے کیونکہ ہم ہر چیز پر قادر ہیں کوئی امر ہماری قدرت سے باہر نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اے لوگو عبادت اختیار کرو اپنے پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو کہ تم سے پہلے گذر چکے ہیں. عجب

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً

نہیں کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ۔ وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت

وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ

اور برسایا آسمان سے پانی پھر دکھ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں کی غذا کو تم لوگوں کے واسطے

فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲

اب تو مت ٹھیراؤ اللہ کے مقابل اور تم جانتے بوجھتے ہو۔

ایک عام خطاب

یہاں تک خدا تعالیٰ نے، مومنین، کفار اور منافقین کی تین جماعتوں کا حال، ان کی صفات وخصوصیات اور یہ کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں کیا کر رہے ہیں۔ اور آخرت میں ان کے ساتھ کیا معاملہ پیش آنے والا ہے۔ ان میں سے کون سعید ہے اور کس جماعت کی قسمت میں ازلی اور نہ ختم ہونے والی شقاوت لکھ دی گئی ہے۔ اس تفصیلی خطاب کے بعد اب سب کو ایک عام حکم یا یوں کہئے ایک بلا تخصیص اور کسی امتیاز کے بغیر "دعوت عام" ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ "اے انسانو! خدا تعالیٰ کی عبادت کرو اس خدا کی جس نے تمکو پیدا کیا الخ"

علقمہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جب "یاایھا الناس" سے خطاب ہوتا ہے تو "مکہ" والے پیش نظر ہوتے ہیں۔ اور جب مدینہ والوں سے گفتگو ہوتی ہے تو "یا ایھا الذین امنوا" سے گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق یہاں "مکہ" کے مشرکین سے بات چیت شروع ہے۔ عربی اسلوب میں "یا" کسی ایسے شخص کو آواز دینے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو دور اور فاصلہ پر ہو۔ اور "ای" نیز "ہمزہ" قریب میں موجود کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن پھر توسع سے کام لیا اور "یا" کو اس شخص کے لئے بھی استعمال کر لیتے ہیں جو غفلت کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ اگرچہ وہ قریب ہی ہو لیکن اس کے طرز عمل (غفلت) کی وجہ سے اس کو فاصلہ پر اور بعید سمجھ لیا گیا۔ بہر حال جب "یا" کے ذریعہ سے کسی ایسے شخص کو خطاب ہو جو قریب ہی میں ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو بات اس سے کی جانے والی ہے۔ وہ نہایت اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ اس کی طرف سے غفلت نہ ہونی چاہیئے۔ شاید یہاں یہ اشکال پیش آئے کہ جب "یا"، حرف ندا ہے اور اس کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو دور اور فاصلہ پر ہو تو پھر دعا میں خدا تعالیٰ کے لئے یا اللہ۔ یا رب وغیرہ کیوں کہتے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ حل اس اشکال کا یہ ہے کہ واقعہ تو یہی ہے کہ خدا تعالیٰ بہت قریب اور بے حد نزدیک ہیں۔ انہیں کے ارشاد کے مطابق شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ لیکن انسان اپنے تخیل اور تصور کے مطابق ان کو دور سمجھے ہوئے ہے یا یوں کہیئے کہ تواضعاً ان کو دور گردان کر عرض پیرا ہوتا ہے۔ اور اس کے تحت الشعور میں یہ حقیقت موجود ہے کہ دعاؤں کو وہی قبول کرتے ہیں۔ اور خود اس کو بھی اپنی دعا کی قبولیت کی شدید تمنا ہے۔

حکم دیا گیا ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ارشاد کے مطابق قرآن مجید میں جہاں کہیں عبادت کا لفظ آیا ہے۔ معنٰی اس کے یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کو ایک جانو اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ وہی خدا تعالیٰ عبادت کے قابل ہے جس نے تمکو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، گویا کہ یہ جملہ صفت کاشفہ کے طور پر ہے۔ کیونکہ مشرکین اپنے خداؤں کو رب کے نام سے پکارتے تھے، تخلیق، ایک معدوم چیز کو صحیح اندازہ اور شکل میں موجود کر دینے کا نام ہے۔ معتزلہ تخلیق کی تعریف صرف اتنی کرتے ہیں کہ وجود میں لے آنا،

کسی چیز سے وجود میں لے آنا یہ وہ بیان نہیں کرتے، اہل سنت اور معتزلہ کی تخلیق کی جو تعریف مختلف ہوگی وہ اس لئے کہ معتزلہ کے یہاں معدوم بھی ایک چیز ہے کیونکہ ان کے یہاں چیز کی تعریف یہ ہے کہ وہ جانی جا سکے۔ اور اس کے متعلق کچھ کہا جا سکے اور معدوم پر ان کے خیال میں "شے" کی یہ تعریف صادق آتی ہے۔ اس لئے وہ معدوم کو شے کہتے ہیں اور شے موجود ہوتی ہے معدوم نہیں ہوتی۔ اور اہل سنت کے خیال میں شے صرف موجود کو کہیں گے۔ ارشاد ربانی میں اس حقیقت پر بھی خاص طور پر زور دیا گیا تھا کہ ہم نے تمکو بھی پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو بھی اور جب تم خود بھی اس کا اقرار کہتے ہو اور اعتراف کرتے ہو کہ خدا تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی پیدا کرنے والا نہیں تو پھر یہ کیا بات ہے کہ عبادت اس کی چھوڑ کر دوسروں کی کرنے لگتے ہو حالانکہ عقل کا مطالبہ ہے کہ جس نے پیدا کیا عبادت اسی کی ہونی چاہیئے۔

فرمایا کہ اگر تم نے عبادت میں اس موجودہ بے راہ روی کو چھوڑ کر صحیح راہ اختیار کرلی تو تم یقیناً خدا تعالیٰ کے اس عذاب سے بچ جاؤ گے جو مشرکین کا مخصوص حصہ ہے، اس موقع پر الفاظ یہ اختیار کئے گئے ہیں کہ شاید (لَعَلَّ) تم بچ جاؤ، حالانکہ شرک نکرنے کی صورت میں عذاب سے محفوظ رہنا ایک یقینی امر ہے پھر اس اسلوب کو اختیار کرنے کی کیا وجہ؟ مفسرین نے جواب یہ دیا ہے کہ یہ ایک شاہانہ انداز کلام ہے ان کے یہاں یقینی وعدوں کے لئے بھی اسی طرح کے انداز اختیار کئے جاتے ہیں۔ سیبویہ مشہور نحوی نے اس موقع پر یہی رائے پیش کی ہے۔ اگرچہ ایک دوسرے نحوی "قطرب" نے یہ بھی کہا کہ یہ (لعلّ) "کے" کے معنے میں ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر متقین پر خود ہی دلالت کرے گا۔ بات کو درست کرنے کے لئے کسی بھی توجیہ کی ضرورت نہ رہے گی،

یہ نشانیاں

ارشاد ہے کہ ذرا کائنات پر نظر ڈالکر دیکھو تم کو معلوم ہوگا کہ یہ آسمان کس نے پیدا کیا، زمین کس نے بچھائی۔ اور آسمان سے پانی کون برساتا ہے اور زمین سے پھر طرح طرح کے پھل پھول، میوے کون لگاتا ہے؟ جب تمہاری نظر کائنات کا جائزہ لیکر دو ٹوک فیصلہ کرتی ہے کہ ان سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ایک خدا تعالیٰ ہی ہے تو پھر کیا غضب ہے کہ ان حقیقتوں کے ابھر آنے کے باوجود شرک کی گندگی میں مبتلا ہو۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے الذی، محل نصب میں ہے۔ کیونکہ مقام درج ہے اور ہو سکتا ہے کہ محل رفع میں ہو۔ اور "ھو" محذوف ہو۔ زمین کے متعلق فرمایا کہ اس کو فراش بنا دیا فراش کے معنے بستر وغیرہ کے آتے ہیں مطلب یہ ہے کہ زمین کو موجودہ شکل وصورت میں اس طرح کر دیا گیا کہ تم اس پر بیٹھتے ہو۔ سوتے ہو چلتے پھرتے ہو۔ قرآن مجید نے اس موقع پر زمین کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا اس سے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ زمین مسطح ہے یا کروی شکل میں کیونکہ فراش ہونے کا فائدہ اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے جب کہ وہ کروی شکل میں ہو اور اس صورت میں بھی جبکہ وہ مسطح ہو۔

ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ نکرہ "فراشاً" جعل کا دوسرا مفعول ہے اور پہلا مفعول الارض تھا۔ آسمان کے متعلق ارشاد ہے کہ اس کو چھت بنا دیا اگرچہ اس موقع پر قرآن مجید نے "بناء" کا لفظ اختیار کیا ہے لیکن قرآن ہی کی ایک دوسری آیت سے متعین ہو جاتا ہے کہ یہاں یہ "بناء" چھت کے معنے میں ہے۔ وہ دوسرا موقع یہ ہے۔ "وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا" اس سے معلوم ہوا کہ آسمان چھت ہے اور بناء سے یہی مراد ہے۔ یہ مصدر ہے،

پھر ارشاد ہے کہ بارش برسائی اور اس کے ذریعہ سے پیداوار ہر طرح کی ہوئی یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ چیزوں کو اگانے کا بارش محض ایک ذریعہ ہے ایسا ہرگز نہیں کہ بارش ہی ان میوہ جات، پھل پھول، ترکاریوں کی پیدا کرنے والی

ہو۔ جیسا کہ بچہ کو درحقیقت پیدا کرنے والے تو خدا تعالیٰ ہی ہیں۔ لیکن مادہ منویہ کو اس کا ایک ذریعہ بنا دیا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ اس پر بخوبی قادر ہیں کہ تمام چیزوں کو ان اسباب کے بغیر بھی پیدا کر دیں، جیسا کہ خود ان اسباب کو انھوں نے پیدا کیا، مثلاً، آپ پھل پھول وغیرہ کی پیدائش کا ذریعہ بارش کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ بارش صرف ذریعہ نہیں بلکہ پیدا کرنے والی ہے تو سوال ہوگا کہ خود اس بارش کو کس نے پیدا کیا؟ ماننا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ ہی نے پیدا کیا، تو جس طرح وہ اسباب کو پیدا کر سکتے ہیں ایسے ہی وہ ان تمام چیزوں کو کسی سبب کے بغیر بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس دنیا میں ان کا ایک قانون ہے اور وہ یہ کہ وہ چیزوں کے لئے کچھ اسباب متعین کر دیتے ہیں اور پھر ایک حالت سے دوسری حالت کی جانب، ترقی و انتقال انہیں متعین اسباب کے ماتحت ہوتا ہے، مقصد اس سے یہ ہے کہ انسان عبرت کی نظر سے دیکھے اور کائنات سے وہ سبق حاصل کرے جو کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے، ترکیب نحوی کے اعتبار سے "من" "من الثمرات" میں یا تو تبعیض کے لئے ہے یا پھر بیان کے لئے، اور "رزقاً" اگر یہ من تبعیض کے لئے تھا تو اس کا مفعول لہٗ ہوگا۔ ورنہ تو پھر اخرج کا مفعول بہ ہوگا بشرطیکہ من کو بیانیہ لے لیا جائے۔

اس موقع پر یہ بھی نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن مجید نے "ثمرات" کا لفظ اختیار فرمایا ثمر (مفرد) یا ثمرات (جمع) کا لفظ اختیار نہیں کیا ہے۔ حالانکہ بارش سے لاکھوں انواع اور اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ گنے چنے پھل پیدا ہوں ایسا نہیں۔ تو پھر اس لفظ کو اختیار کرنے کی وجہ کیا ہے؟ جواب بعض مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہ اسلوب اس لئے اختیار کیا گیا تاکہ تمام ہی اقسام کے پھلوں کی پیداوار کا ذکر ہو جائے خاص زور اس پر دیا گیا کہ پھلوں کے یہ ڈھیر کے ڈھیر تمہارے ہی لئے پیدا کئے گئے کسی اور کے لئے نہیں۔

پھر یہ شرک کیسا؟

ارشاد ہے کہ جب توحید کے یہ دلائل کائنات میں قدم قدم پر یوں بکھرے ہوئے ہیں اور انسان کو ہر لحہ یہ سمجھا رہے ہیں کہ تمہارا خالق صرف وہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں تو پھر اے انسانو! تمکو کیا ہو گیا کہ تم شرک میں مبتلا ہو حالانکہ تمکو اس شرک سے بیزار ہونا چاہئے تھا۔ کیونکہ عبادت کی بنیاد توحید ہے۔ ندٌ کے معنیٰ، شریک، نظیر اور مثل کے آتے ہیں۔ مگر عموماً مخالف ہی پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، ترکیب نحوی پر بھی ذرا توجہ فرمایئے جیسا کہ پہلے بتایا گیا تھا کہ الذی، مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع پڑھا جا سکتا ہے۔ اگر الذی مبتدا تھا تو فلا تجعلوا الخ اس کی خبر ہو جائے گی۔ لیکن خبر پر یہ فاء کیسے آ گئی؟ تو حل اس کا یہ ہے کہ یہ فاء اس وجہ سے داخل ہوئی کیونکہ کلام جزا کے معنیٰ لئے ہوئے ہے اور اس ترکیب سے حاصل ہونے والے معنے یوں ہوں گے کہ جب تم ان دلائل و آیات کو دیکھ رہے ہو جس سے خدا تعالیٰ کا یکتا اور بے مثل ہونا بخوبی ثابت ہوتا ہے اب تم خدا تعالیٰ کے ساتھ شرک نکرو۔

حالانکہ تم بھی خوب جانتے ہو کہ جن کی تم خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کر رہے ہو نہ انھوں نے تمکو پیدا کیا اور نہ تمہاری ضرورتوں کو وہ پورا کرتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہاں مفعول مذکور نہو بلکہ مطلب صرف اتنا ہو کہ تم تو واقف کار اور سنجیدہ آدمی ہو اور جانتے ہو کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ بتوں کو عبادت میں شریک کرنا ایک ایسی حماقت ہے۔ جس کی مثال نہیں مل سکتی۔

ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ جملہ، فلا تجعلوا کی ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کی یہاں تک تفصیلات سے بخوبی سمجھ میں آتا ہے کہ پیش نظر، توحید کا اثبات اور شرک کو باطل و غلط قرار دینے کی کوشش ہے۔ اسی عمودی مضمون پر جو دلائل پیش کئے ان میں سے بعض انسانوں کی تخلیق سے متعلق تھے، یا زمین سے متعلق جو کہ انسانوں کا

گویا کہ مستقر ہے۔ آسمان سے متعلق جو اپنی وضع و قطع کے اعتبار ایک شامیانہ معلوم ہوتا ہے اور آسمانی پانی (بارش) اور زمین کے درمیان ایک ایسا تعلق قائم کر کے دکھایا جیسا کہ شوہر اور بیوی میں ہوتا ہے اور جس طرح عورت اور مرد کے اختلاط سے اولاد پیدا ہوتی ہے ایسے بتایا کہ بارش اور زمین کے اجتماع سے پھل پیدا ہوتے ہیں بہرحال یہ تمام مضامین، توحید کے مضمون کو موکدّ اور شرک کو باطل کرنے کے لئے تھے ان مضامین سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کا مسئلہ بھی کسی حد تک سامنے آگیا چنانچہ اسی مناسبت سے اب ان دونوں اہم حقائق کی جانب توجہ فرما رہے ہیں۔

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن

اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا پھر تم بنا لاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم

مِّثْلِهِ ص وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ

پلہ ہو۔ اور بلا لو اپنے حمایتیوں کو جو خدا سے الگ (تجویز کر رکھے) ہیں اگر تم سچے ہو

صَادِقِينَ ○ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَ

پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکے اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے۔ تو پھر ذرا بچتے رہیو دوزخ سے جس کا

قُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ○

ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ تیار کی ہوئی رکھی ہے کافروں کے واسطے۔

رسالت اور کلام الٰہی

"مِمَّا نَزَّلْنَا" میں ما موصوفہ نکرہ ہے یا اَلَّذِیْ کے معنے میں ہے عبد سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ عبد اس مملوک کو کہتے ہیں۔ جو انسانوں میں سے ہو جبکہ مملوک اس کو کہتے ہیں۔ جس پر زبردستی قبضہ کیا گیا ہو۔ یہاں اس نکتہ سے غفلت نہ کیجئے کہ قرآن مجید نے نَزَّلْنَا استعمال کیا، اَنْزَلْنَا استعمال نہیں کیا (عربی لغت کے اعتبار سے تنزیل، کسی چیز کا آہستہ آہستہ اترنا، اور انزال ایک بار ہی اتر جانا کے معنے میں استعمال ہوتا ہے) وجہ اس کی یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کو بڑا زبردست خلجان قرآن مجید کے بارے میں یہی تھا کہ اگر یہ خدا تعالےٰ کا کلام ہے تو پھر ایک ہی بار محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کیوں نازل نہیں ہوتا۔ یہ کیا بات ہے کہ وقتاً فوقتاً، آیت آیت، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نازل ہو رہا ہے۔ یہ تو عام انسانوں کی عادت ہے کہ تھوڑا تھوڑا کر کے کہتے اور لکھتے ہیں مثلاً آپ شعرا کو دیکھیں گے کہ وہ دیوان اپنے تمام اشعار کا ایک ہی لمحہ میں تیار نہیں کر لیتے۔ بلکہ کہتے رہتے ہیں جب ایک معتدبہ مقدار میں، کلام جمع ہو جاتا ہے تو اس کو مجموعہ کی شکل دے دیتے ہیں۔ یا خطیب، اور نثر نگار "دفعتہً" ہی نہیں لکھتا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے لکھتا رہتا ہے بہرحال یہ اگر خدا تعالیٰ کا کلام ہے تو اس کا نزول یکبارگی ہونا چاہیئے تھا نہ کہ شعرا، اور نثر نگاروں کے طریق و انداز پر۔

خدا تعالیٰ نے ان کے اسی غلط اشکال کو رد کرتے ہوئے کہا اور چیلنج کے طور پر کہا کہ اگر قرآن کی موجودہ

نزولی کیفیت سے تمکو کوئی اشکال پیش آرہا ہے تو پھر آؤ اور اس کلام الٰہی کو اس معیار پر پرکھکر دیکھو کہ تم بھی اس کا جواب لاسکتے ہو یا نہیں؛ زیادہ تو کیا قرآن کی مختصر اور چھوٹی سے چھوٹی سورت کے مقابلہ میں کوئی سورت لکھ کر دکھاؤ۔ سورۃ کا قرآن مجید کے مختصر اور تین آیتوں والے کلام پر اطلاق ہوتا ہے۔ لفظ سورۃ میں واؤ اگر اصلی ہے تو پھر شاید یہ سور المدینہ سے لی گئی ہے، سور المدینہ شہر کی چہار دیواری کو کہتے ہیں گویا کہ قرآن مجید کا یہ حصّہ اسی طرح گھرا ہوا اور محفوظ ہے جیساکہ شہر چہار دیواری سے محفوظ ہوتا ہے یا قرآن مجید کی سورت، علوم و معارف، مضامین و بلند حقائق پر اس طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جیساکہ شہر کی چہار دیواری ایک خوبصورت عمدہ اور بارونق شہر پر۔

اور ہو سکتا ہے کہ سورۃ کو سورہ، مرتبہ اور ترقی کے اعتبار سے کہتے ہوں کیونکہ قرآن مجید کی سورتیں بھی گویا کہ متعدد منزلیں ہیں جن میں قاری ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف ترقی کرتا ہے۔ اور خود سورتوں میں ترتیب ہے کہ بعض سورتیں، چھوٹی اور مختصر ہیں بعض بڑی بڑی اور طویل، اور کچھ درمیانی درجہ کی ہیں نہ مختصر اور نہ طویل۔ یا ان کو سورۃ اس لئے کہا جاتا ہو کہ دین و شریعت میں قرآن مجید کا اس کی سورتوں کی آیات کا ایک ایک حرف کا وہ مقام و مرتبت ہے جو اور کسی چیز کو حاصل نہیں۔ لیکن اگر سورۃ کا واو اصلی نہیں بلکہ ہمزہ سے بدلا ہوا ہے تو پھر سورت کو سورۃ اس لئے کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا ایک ٹکڑہ ہے جیساکہ باقی ماندہ چیز، اصل چیز کا باقی اور ایک حصّہ ہوتا ہے۔

اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ قرآن مجید کو اس طرح سورتوں میں تقسیم کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ اس کا کوئی مفصل جواب دینے سے پہلے اتنا سن لیجئے کہ فائدے بہت ہیں، لیکن ہم کچھ ہی بیان کرتے ہیں، یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے دوسری آسمانی کتابیں بھی قرآن مجید ہی کی طرح مختلف سورتوں میں تقسیم کیں اور مصنّف بھی عموماً اپنی تصانیف کو مختلف ابواب اور فصلوں میں تقسیم کرتے ہیں سو اگر اس طرز میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ خواہ مخواہ اس دردسری کو کون مول لیتا، بہرحال اب ہم کچھ فائدے ذکر کرتے ہیں پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ جب کلام، عام ہو اور اس کے تحت میں مختلف مضامین اور متعدد اقسام کے بیانات آرہے ہوں تو بہتر یہی ہے کہ ان کو مختلف ذیلی عنوانات، اور جدا جدا مباحث میں تقسیم کردیا جائے۔ دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ قاری کے ذہنی نشاط کی اہمیت کا مل رعایت ہوگئی۔ کیونکہ اگر پڑھنے والا مسلسل ایک ہی کلام کو پڑھتا چلا جائے جس کو درمیان میں کاٹ کر ایک حصّہ کو دوسرے حصّہ سے جدا نہ کیا گیا ہو تجربہ شاہد ہے کہ ایسے مضامین پڑھنے سے آدمی اکتا جاتا ہے۔ لیکن اگر بات کتنی ہی لمبی ہو مگر اس کو مختلف ٹکڑوں اور حصوں پر تقسیم کردیا جائے تو پڑھنے اور سننے والے اکتاتے نہیں بلکہ ان کا ذہن برابر بڑے انشراح کے ساتھ محظوظ ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ اسی لئے قرآن مجید کو بھی مختلف سورتوں اور حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ حافظ جب قرآن مجید کی ایک سورۃ مثلاً یاد کرلیتا ہے تو اس کو یقین ہوتا ہے کہ اس نے قرآن مجید کا کچھ ایسا حصہ محفوظ کرلیا جس کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اور اس تصور سے فائدہ یہ پہونچتا ہے کہ جتنا قرآن اس کو محفوظ ہوچکا اس کی عظمت اس کے قلب میں موجزن ہوتی ہے چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت بھی ہے کہ جو شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں سورۃ بقرہ اور سورہ آل عمران کو یاد کرلیتا تھا ہماری نظروں میں اس کی خاص وقعت ہوجاتی تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ نماز میں ایک مستقل اور مکمل سورت کا پڑھنا ضروری اور افضل قرار دیا گیا ہے، بہرحال گوناگوں

فائدوں میں سے یہ چند آپ کے سامنے رکھے گئے، اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ سورتوں میں قرآن مجید کی تقسیم بے فائدہ اور بے منفعت ہے۔

ترکیب نحوی کے اعتبار سے "من مثلہ" قرآن مجید کی سابقہ آیت "فاتوا بسورۃ" کے متعلق ہے نیز اس کی صفت ہے اور ضمیر جو کہ "مثلہ" میں ہے وہ "ما نزّلنا" کی طرف راجع ہے۔ اور اس ترکیب نحوی سے حاصل ہونے والا مطلب یہ ہوگا کہ یونہی سورۃ گھڑ گھڑا کر، مہمل پیش کر دینا کافی نہ ہوگا بلکہ ایک ایسی سورت لاؤ جو حسن بلاغت شوکت کلام اور ایجاز و اختصار، اعجاز و فصاحت میں قرآن کی سورۃ کی واقعی ہم پایہ ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ ضمیر "عبدنا" کی طرف راجع ہو اس صورت میں مطلب یہ، ہوگا، کہ اگر مقابلہ میں کوئی سورۃ پیش کرنا چاہتے ہو تو ایک ایسے شخص سے تیار کرا کر لاؤ جو ان پڑھ ہو، کسی سے علم حاصل نہ کیا ہو اور نہ کسی درسگاہ میں کچھ وقت گزارا ہو کیونکہ ہمارے رسول امیؐ بھی انہیں صفات کے حامل ہیں عہ۱۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ اس ضمیر کو منزّل کی طرف راجع کیا جائے کیونکہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ "منزّل" قرآن مجید ہی کی نظیر کا مطالبہ ہے، اس مطالبہ میں کوئی اور چیز پیش نظر نہیں اس کے علاوہ منزّل کی طرف ضمیر لوٹانے سے ترتیب کی برجستگی بھی قائم رہتی ہے۔ کیونکہ گفتگو اس میں ہو رہی ہے کہ قرآن "منزل من اللہ" ہے بھی یا نہیں، اشکال اس میں نہیں کہ آپؐ پر نازل ہوتا ہے یا آپ غلط کہتے ہیں عہ۲ تو مطلب یہ ہوا کہ اگر تم کو قرآن مجید کے بارے میں شبہ ہے کہ وہ منزل من اللہ نہیں تو تم بھی اس کی ایک ہی سورت کی نظیر پیش کر کے دکھاؤ۔ اور اگر شبہ کفار کے ذہن میں یہ ہوتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا ہے یا نہیں تو پھر مطالبہ کی نوعیت قطعاً مختلف ہوتی اور اس توجیہ سے بعد میں آنے والے مضامین بھی مرتب ہو جاتے ہیں۔

ارشاد ہے کہ قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے کی مہم میں صرف تم ہی نہیں بلکہ اپنے تمام مددگاروں کو بھی لو۔ وہی تمہارے مددگار جن کو تمہاری باطل پرستی نے خدا تعالیٰ کے علاوہ کھڑا کیا ہے اور جن کے متعلق تم اس ذہنی فریب میں مبتلا ہو کر وہ قیامت میں تمہارے بارے میں شہادت دیں گے کہ یہ لوگ حق پر تھے۔ اور ہو سکتا ہے کہ مطلب یہ ہو کہ انکو اپنی مدد کے لئے بلاؤ جو یہ شہادت دے سکیں کہ تمہارا تیار کردہ کلام قرآن کی نظیر ہے۔

ارشاد ہے کہ قرآن مجید کے مقابل میں ایک دوسرا قرآن تیار کرنے کے چیلنج پر کیوں آگے نہیں بڑھتے اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے تھے کہ یہ قرآن ایک من گھڑت داستان یا خود محمدؐ کا تیار کردہ کلام ہے تو پھر مقابلہ کی دعوت ضرور قبول کرنی چاہئے تھی ترکیب نحوی کے اعتبار سے "شرط" کا جواب محذوف ہے۔ لیکن اس محذوف شرط پر

عہ۱ اس آخری توجیہ پر قلب مطمئن نہیں، آیا کیونکہ قرآن مجید اپنی بلاغت، ایجاز، شوکت کلام، نظم و نسق اور نادر و نایاب دروبست کے اعتبار سے ایک ایسا کلام ہے کہ اُمّی تو درکنار، فضلائے عصر اور فخر روزگار علماء بھی اس کا جواب پیش کرنے سے قطعاً عاجز ہیں پھر اس توجیہ کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔

عہ۲ گویا کہ یہاں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ انکو کلام اللہ کے بارے میں تو اطمینان ہے کہ وہ اللہ تعالےٰ ہی کا کلام ہے اور کسی کا کلام نہیں لیکن شبہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ہے کہ ان پر نازل بھی ہوتا ہے یا معاذ اللہ وہ غلط دعویٰ کرتے ہیں۔ اور دوسری بات یہ کہ خود کلام کے بارے میں شبہ ہو کہ یہ کلام خدا تعالیٰ کا ہے بھی یا نہیں مفسر مدارک سمجھانا یہ چاہتے ہیں کہ مشرکین عرب کو کلام اللہ کے بارے میں شبہ تھا یعنی وہ اس کو خدا تعالیٰ کا کلام ہی نہیں مانتے۔ آپؐ کے بارے میں کوئی بحث وہ کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

کلام سابق دلالت کرتا ہے۔ اس ترکیب سے حاصل معنے یہ ہیں کہ اے کفار اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ قرآن مجید الہامی، آسمانی کتاب نہیں بلکہ وہ محمدؐ کی ایک تیار کردہ داستان پاستان ہے تو تم بھی قرآن جیسی چند سورتیں تیار کر لاؤ اور اس مہم میں اپنے مددگاروں سے امداد و اعانت بھی طلب کرو۔

ایک وعید ارشاد ہے کہ اگر تم قرآن مجید کا مثل تیار نہیں کر سکتے (اور ہم اپنے غیر محدود علم کی وجہ سے خوب جانتے ہیں کہ تم ہرگز قرآن مجید کی نظیر تیار نہیں کر سکتے) تو پھر ذرا ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔ گویا کہ جب ان منکرین کے لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و سچائی کو آزمانے کی ایک صورت تجویز فرمادی تھی یعنی یہی کہ وہ بھی قرآن مجید کی نظیر تیار کرنے کی کوشش کر دیکھیں لیکن جب یہ اس صورت کو اختیار کرنے کی جرأت نہیں کرتے تو اب ارشاد ہے کہ مقابلہ نکرنے کی صورت میں تم پر تمہارا عجز، قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے واضح ہوگیا۔ اور ایسی صورت میں لازم ہے کہ اب تم قرآن مجید کے آسمانی صحیفہ ہونے کی شہادت دو۔ اور اس پر ایمان لاؤ۔ اور اگر اب بھی بدستور سابق انکار و معاندت کی راہ اختیار کرتے ہو تو اس عذاب سے ڈرتے رہو جو خاص طور پر منکرین و معاندین کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

نکتہ اس آیت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی صداقت پر دو اہم ترین دلائل بھی موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس امر کا ان کے سامنے اعلان کیا گیا تھا یعنی وہ قرآن جیسی چند سورتیں تیار کریں، مقابلہ سے ہٹ جانے کی صورت میں، خوب معلوم ہوگیا کہ قرآن کریم ایک سراپا اعجاز صحیفہ ہے (اور اس طرح آپؐ کی نبوت کی تصدیق ہوئی۔ کیونکہ آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ یہی قرآن حکیم ہے)، اور دوسری دلیل یہ اطلاع کہ تم قرآن کی نظیر تیار نہیں کر سکتے ایک پیشینگوئی تھی جس کا تعلق غیب سے تھا۔ جس کو خدا تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا لیکن اس کا اعلان، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے آپؐ کی نبوت کی صداقت کی ایک گہری دلیل ہے۔

قرآنی لطائف ظاہر ہے کہ اہل عرب اپنی فصاحت و بلاغت پر جس درجہ اعتماد اور ناز کرتے تھے اس کے ہوتے ہوئے، اس معاوضہ دعوت پر غور و فکر کرنے سے پہلے قرآن کی نظیر لانے کا معاملہ مشتبہ تھا۔ یعنی اولین لمحہ میں وہ منکرین خود کو عاجز تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے تھے تا وقتیکہ اس سلسلہ میں اپنی کوششوں کو ناکام نہ دیکھ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے گفتگو کا آغاز "اِن" سے فرمایا جو کلام عرب میں شک کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ الخ "اِذَا" سے گفتگو کا آغاز نہیں ہوا حالانکہ عرب "اذا" کو کسی حتمی امر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

دوسری رعایت کلام میں یہ بھی ملحوظ رہی کہ "فاتوا" کے بجائے "فافعلوا" یعنی اتیان کے مقابلہ میں فعل کا لفظ استعمال کیا گیا یہ اس لئے کہ فعل بھی بہر حال ایک فعل ہی ہے۔ نیز فعل استعمال کرنے سے کلام میں اختصار بھی ہوگیا کیونکہ "فاتو" استعمال کرنے کی صورت میں کلام یقیناً طویل ہو جائے گا۔

نیز ترکیب نحوی کے اعتبار سے "ولن تفعلوا" جملہ معترضہ ہے اور اسی لئے اس کا کوئی محل اعراب بھی نہیں اور یہ جملہ یعنی ولن تفعلوا برجستہ کلام ہے۔ کیونکہ ابتدائے کلام میں جو شرط کے الفاظ استعمال کئے گئے تھے یعنی اِن کنتم اس کے بعد بات صاف نہیں بلکہ الجھاؤ میں پڑ گئی تھی اور یہ فیصلہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آیا قرآن کا جواب دینے سے عاجز ہیں یا جواب کی قدرت ان میں موجود ہے۔ "ولن تفعلوا" نے تردد کے یہ کانٹے نکال ڈالے اور اب طے ہوگیا کہ کفار قرآن مجید کا جواب تیار کرنے کی ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ "لَا" اور "لَنْ" کلام عرب میں دونوں ہی مستقبل

میں کسی چیز کی نفی کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ ہاں لَن میں ایک تاکید کا مفہوم ہے جس سے "لا" خالی ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ لَن اصل میں "لا اَن" تھا اور فراء کی رائے ہے کہ یہ "لا" ہے جس کی آخری الف نون سے بدل دی گئی۔ اور سیبویہ امام النحو کا خیال ہے کہ لَن مستقل ایک لفظ ہے جس کو مستقبل میں نفی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔

کچھ مباحث

رہ جاتا ہے یہ مسئلہ کہ قرآن مجید کی سورتوں جیسی ایک آدھی سورت بھی پیش کرنے سے کفار عاجز رہے کیا یہ بات ٹھیک ہے یا یونہی ایک دعویٰ تو اس سلسلہ میں یہ معقول بات کافی ذہنی خلجانات کو رفع کر سکتی ہے کہ کفار کی طرف سے کوئی جواب فی الواقع پیش نہیں کیا گیا کیونکہ اگر کوئی جواب دیا جاتا تو یقیناً اس کو محفوظ رکھتی جبکہ قرآن مجید کی طرف سے دفاع کرنے والوں کے مقابل میں قرآن مجید کے منکرین عددی اعتبار سے بھی ہمیشہ فائق رہے اس کے علاوہ ذرا غور کیجئے خود قرآن مجید کے بیانات بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ کفار قرآن مجید کا جواب نہیں دے سکے، کیونکہ قرآن مجید نے آخر میں ان سے کہا کہ وہ خود کو آتش جہنم سے بچائیں کلام کی مسلسل لڑیاں یہ بتاتی ہیں کہ اے کفار جب تم باوجود چیلنج کے قرآن کی نظیر پیش کرنے سے عاجز رہے اور جس کے نتیجہ میں تمکو آپؐ کی نبوت کی تصدیق ہوگئی لیکن پھر بھی تم عناد و انکار سے کام لے رہے ہو اب تمہاری یہ روش یقیناً ایک ابدی عذاب یعنی جہنم کا پیش خیمہ ہے۔

گویا کہ کنایہ کے طور پر کہا گیا کہ اپنے عجز کے واضح ہونے کے باوجود خود کو دائمی عذاب سے محفوظ رکھو، کنایہ بلاغت کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ کنایہ کا سب سے بڑا فائدہ کلام میں اختصار ہے اور ایجاز و اختصار قرآن مجید کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے وقود، ایندھن کو کہتے ہیں جس سے آگ جلائی جاتی ہے یہ لفظ واؤ کے ضمہ اور فتح دونوں طرح مستعمل ہے۔ ہاں عربی زبان کے قواعد کچھ اس طرح ہیں کہ اس میں التی اور الذی ان دونوں اسم موصول کا صلہ مخاطب کو معلوم ہونا ضروری ہے۔ اب اس قاعدہ کے پیش نظر آیت میں جو "التی" استعمال ہوا ہے یعنی فاتقوا النار التی اس کا صلہ کفار کو کیسے معلوم تھا تو بعض مفسرین کی رائے میں کفار اس آگ کی تفصیلات سے اہل کتاب کے ذریعہ واقف تھے یعنی اسکی تفصیلات انکو یہود و نصاریٰ سے پہنچی تھیں اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے یہ تفصیلات خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوں یا اس آیت سے پہلے کسی اور آیت میں اس خوفناک آتش جہنم کا تذکرہ آچکا ہو۔ بہر حال کچھ بھی ہو اس قدر وہ ضرور جانتے تھے کہ ان سے اس آتش جہنم کے بارے میں گفتگو کی جا سکے

مکی آیات میں نار کو بصورت نکرہ ذکر کیا گیا اور یہاں معرفہ کیونکہ پہلے وہ معلوم ہو چکی تھی گویا کہ مدنی آیتہ میں اس کا نزول مکرر ہوا ہے۔

کیسی خوفناک آگ

اس آتش جہنم کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا گیا کہ یہ عام آگ نہیں ہوگی جس کو لکڑیوں سے جلایا جاتا ہے بلکہ ایک ایسی خوفناک آگ ہوگی کہ اس کا ایندھن لکڑیوں کے بجائے انسان اور پتھر ہیں۔ پتھر سے اس موقع پر گندک مراد ہے جو بہت جلد آگ پکڑتی ہے اور دیر میں بجھتی ہے بڑی بدبودار اور آدمی کے بدن کو چمٹ جاتی ہے اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ پتھر سے بت مراد ہیں کیونکہ جب کفار دیکھیں گے کہ ہمارے بت جو ہمارے معبود تھے ہمارے ساتھ ہی جلائے جا رہے ہیں تو ان کی بے کسی اور اپنی بے چارگی پر خوب ہی متاسف اور ملول ہوں گے۔

بہر حال یہاں انسانوں کے ساتھ پتھروں کا ذکر اس لئے ہے کہ کفار نے دنیا میں خود کو انہیں پتھروں سے ربط کر رکھا تھا یعنی وہ انہیں پتھروں کی پوجا پاٹ میں وقت گزارتے تھے۔ اور انکو خدا تعالےٰ کا (معاذ اللہ) شریک بتاتے تھے۔ جیسا کہ ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے کہ "اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ" تم اور جن کی تم خدا تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ اس آیت میں بھی بتوں کا تذکرہ اور یہ کہ وہ بھی جہنم میں

جلیں گے، کفار ہی کو تکلیف پہونچانے کے لئے ہے۔

ارشاد ہے کہ یہ آگ منکرین کے لئے تیار کی گئی ہے "اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ" اس سے معلوم ہوا کہ جہنم مخلوق و موجود ہے۔ یہ نظریہ ان لوگوں کے خلاف ہے جو جہنم کے مخلوق ہونے کے قائل نہیں ہیں۔

وبشر الذین امنوا وعملوا الصلحت ان لهم جنت تجری

اور خوش خبری سنا دیجئے آپ اے پیغمبر ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بیشک ان کے واسطے بہشتیں ہیں

من تحتها الانهر کلما رزقوا منها من ثمرة رزقا قالوا هذا

کہ چلتی ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں۔ جب کبھی دیئے جائیں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے

الذی رزقنا من قبل واتوا به متشابها ولهم فيها ازواج

کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیبیاں ہوں گی۔

مطهرة وهم فيها خلدون ○

صاف پاک کی ہوئی اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے۔

خوش خبری

قرآن مجید میں خدا تعالیٰ کا خاص اسلوب یہ ہے کہ وہ ترغیبی مضامین کے ساتھ، ترہیب کے مضامین بھی ذکر فرماتے ہیں۔ تاکہ لوگوں کو اچھی چیزوں کو حاصل کرنے کا شوق اور بری باتوں سے بچنے کی طرف توجہ ہو۔ اس لئے جب کفار کا ذکر، ان کی بد اعمالیوں کا تذکرہ اور ساتھ اس عذاب کی اطلاع دیگئی جو ان پر ہونے والا ہے۔ تو اب مومنین، ان کے نیک اعمال اور ان کو عطا ہونے والی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ ارشاد ہے کہ مومنین کو جنھوں نے نیک کام کئے خوش خبری سنا دیجئے

سوال یہ ہے کہ کون خوش خبری سنائے؟ بعض کی رائے ہے کہ خطاب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے کہ آپ تمام مومنین کو یہ بشارت دیں۔ اور یہ بھی رائے ہے کہ ہر وہ شخص بشارت دے جو اس خوش خبری کو پہونچانے کی صلاحیت رکھتا ہو (یعنی مومن ہو اور نیکوکار) یہ دوسری رائے زیادہ پسندیدہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بشارت کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص بشرط صلاحیت اس کو دوسروں تک پہونچائے۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے "بشّر" کا عطف فاتقوا پر ہو رہا ہے۔

ایک فقہی نکتہ

بشارت اس خوش خبری کو کہتے ہیں جس کو سنکر چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں ہوں۔ چنانچہ فقہاء نے اس لفظ کے اسی مفہوم کے پیش نظر یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے غلاموں سے کہا کہ تم میں سے جو بھی مجھکو فلاں شخص کی آمد کی خوشخبری دے گا وہ آزاد ہے۔ اس پر تمام غلاموں نے علیٰحدہ علیٰحدہ اس شخص کی آمد سے اپنے آقا کو مطلع کیا تو آزاد صرف پہلا ہی غلام ہوگا کیونکہ آمد کی خبر سنکر غیر معمولی مسرت اور اس کے چہرہ پر اثنا ظاہر ہے کہ پہلے ہی خبر دینے والے کی خوشخبری سے نمایاں ہوئے ہوں گے۔ اور اگر آقا نے یہ کہا کہ جو بھی مجھکو فلاں کے آنے کی

اطلاع دے گا تو وہ آزاد ہے اور سب نے خبر دی اگرچہ علیحدہ علیحدہ دی تاہم سب آزاد ہو جائیں گے۔ کیونکہ خبر دینے میں یہ سب شریک ہیں اور آقا، نے اپنے کلام کے اعتبار سے صرف "اطلاع" ہی تک آزادی موقوف کی تھی۔

بشرہ چہرہ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ظاہری حصہ جسم کا ہوتا ہے تباشیر بھی اسی سے ہے۔ صبح کی پہلی کرن کے لئے استعمال ہے جہاں اس کے مادہ میں ظہور کے معنے پائے جاتے ہیں۔ ہاں کبھی بری اطلاع کے لئے بھی بشارت کا لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ اس سے مقصود ذرا مخاطب کا لطیف مذاق بنانا ہوتا ہے۔ بلکہ بڑی حد تک اس کو ایک ذہنی کوفت میں مبتلا کر دینا۔ کیونکہ الفاظ بشارت کے ساتھ، تکلیف دہ کی اطلاع ذہنی کوفت کا یقیناً باعث ہو گی اس کو یوں سمجھئے کہ آپ اپنے دشمن سے کہیں کہ "تجھ کو تیری اولاد کے قتل کی خوش خبری ہو یا تیرے اموال کے تباہ و برباد ہو جانے کی" ظاہر ہے کہ قتل اولاد اور تباہی اموال پر پھر یہ دل خراش اسلوب اور بھی زہر ہلاہل ثابت ہوگا۔ "صالحہ" اپنے مفہوم اور معنی کے اعتبار سے "حسنۃ" سے قریب ہے "صالحات" جمع ان اعمال کو کہتے ہیں جو کتاب و سنت و عقل کے مطابق ہوں۔

"الصالحات" پر "الف لام" جنس کا ہے۔ یہ آیت ان لوگوں کے مسلک کے خلاف ہے، جو اعمال ہی کو ایمان سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس آیت میں اعمال کا ایمان پر عطف کیا گیا ہے اور عطف دو چیزوں کے درمیان مغائرت کی دلیل ہے یعنی اس اسلوب سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ایمان کی حقیقت کچھ اور ہے اور اعمال اس سے جدا ایک حقیقت ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا حل

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کو یہ شبہ پیش آئے کہ احناف جنت میں ان مسلمانوں کے بھی داخلہ کے قائل ہیں جن کے پاس عمل صالح قطعاً نہ ہوں، حالانکہ خدا تعالیٰ نے جنت کی بشارت صرف ان لوگوں کو دی ہے جو نیکوکار ہوں۔ حل اس شبہ کا یہ ہے کہ بشارت کی ہمارے خیال میں دو قسمیں ہیں، ایک "مطلق بشارت" اور دوسری خدا تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ "مقید" بشارت مطلقہ کے لئے ہم بھی اعمال صالحہ، ایمان کے ساتھ بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن جو کبائر کا مرتکب یعنی جس نے بڑے بڑے گناہ کئے ہوں اس کا معاملہ ہم خدا تعالیٰ پر موقوف کرتے ہیں اگر وہ چاہیں تو اس مغفرت کر دیں اور چاہیں تو عذاب میں مبتلا فرما دیں یہی "بشارت مقیدہ" ہے۔ (اس تفصیل کے بعد احناف کے مسلک پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا)۔

فردوس بریں

ارشاد ہے کہ نیکوکاروں کو خوش خبری دیجئے کہ ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ عربی لغت میں جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس میں کھجور اور دوسرے درخت نہایت گھنے طور پر کھڑے ہوں یہ لفظ اپنے مادہ کے اعتبار سے "چھپنے" کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ جن کو جن اس لئے کہتے ہیں کہ وہ عام نظروں سے چھپا رہتا ہے۔ جنون میں عقل چھپ جاتی ہے جنین (حمل)، عام نگاہوں سے مستور رہتا ہے جنۃ (ڈھال) آدمی خود کو اس کے پیچھے چھپاتا ہے۔ جانّ، سریع الرفتار سانپ جو اپنی پھرتی سے چھپنے کی کوشش کرتا ہے، جنان روح، جسم انسانی میں مستور بلکہ سراپا مستور، دار الثواب کو جنت اس لئے کہا گیا کہ وہاں درختوں کا بے پناہ ہجوم ہے۔

جنت، جہنم کی طرح مخلوق ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ " اسکن انت وزوجک الجنۃ" کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو (ظاہر ہے کہ اگر جنت موجود نہ ہوتی تو اس حکم کا کوئی مطلب ہی نہیں تھا)۔

معتزلہ کی رائے ہے کہ جنت موجود نہیں ہے۔

جنت اگرچہ ایک ہی ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اس کو جمع کی شکل میں ذکر فرمایا ہے یعنی "جنات" ساتھ ہی اس کو نکرہ بھی استعمال کیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ تمام "دار الثواب" کا نام جنت ہے۔ اگرچہ اس میں بے پناہ باغات ہیں۔ جو

نیکوکاروں کے حسن عمل کے مطابق ان کو دیئے جائیں گے "تجری من تحتہا الانہار" ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ جملہ محل نصب میں ہے اور جنات، کی صفت ہے مطلب یہ ہے کہ نہریں درختوں کے نیچے سے جاری ہوں گی جیسا آپ نے دیکھا ہوگا کہ دریا کے کنارے کنارے درختوں کے جھنڈ کھڑے رہتے ہیں اگرچہ باغات میں بہنے والی نہریں کھائیوں کے بغیر بہتی ہیں۔ عام طور پر سب سے زیادہ اچھے باغات وہ سمجھے جاتے ہیں جن میں نہریں بہتی ہوں۔ اور سایہ دار درخت بکثرت ان میں موجود ہوں۔ جدولوں سے بڑی بہنے والی چیز کو نہر کہتے ہیں یہ نہر دریا سے چھوٹی اور جدول سے بڑی ہوتی ہے۔

دریائے نیل کو بھی نیل مصر کہتے ہیں۔ نہر کے مفہوم میں وسعت کے معنے پائے جاتے ہیں۔ نہروں کے ساتھ جاری ہونے کا تعلق مجازی ہے۔ اس آیت میں لفظ انہار کو معرفہ استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ ماقبل میں نہر کا کوئی ذکر نہیں گزرا۔ تو اس کا حل یہ ہے کہ شاید اصل میں "انہارہا" تھا گویا کہ جو تعریف اضافت کی وجہ سے حاصل ہو رہی تھی (یعنی انہار کی اضافت ضمیر ھا کی جانب) اس کو تعریف باللام سے بدل دیا گیا جیساکہ یہی عمل اللہ تعالیٰ کے ارشاد "واشتعل الراس شیبًا" میں ہوا ہے۔

اور ممکن ہے کہ معرفہ استعمال کر کے ان نہروں کی جانب اشارہ کیا گیا ہو جن کا ذکر ذیل کی آیت میں ہوا ہے یعنی "فیہا انہار من ماء غیر آسن" اور یہ تو آپ بھی خوب جانتے ہیں۔ کہ جاری نہریں خدا تعالیٰ کی بڑی نعمت اور ایک عجیب نعمت ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باغات کے ساتھ نہروں کا ذکر فرمایا بلکہ اس نعمت کا تمام ہی نعمتوں سے پہلے ذکر فرمایا۔

ایک عجیب معاملہ ارشاد ہے کہ اہل جنت کو جب کبھی رزق دیا جائے گا پھلوں وغیرہ کی شکل میں تو کہیں گے کہ یہ تو ہمکو پہلے بھی دیا گیا تھا۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے کلما رزقوا" جنات کی دوسری صفت ہے۔ اور جملہ مستانفہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب سننے والے نے یہ سنا کہ اہل جنت کے پاس باغات ہونگے تو یقیناً اس کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ آیا اس کے پھل دنیا کے باغات کی طرح ہوں گے یا فردوسی باغات کے پھل دنیا کے پھلوں سے مختلف ہوں گے؟ اس کو بتانے کے لئے یہ ارشاد فرمایا کہ پھل جنت بریں کے جنساً اتحاد تو رکھتے ہیں۔ دنیا کے پھلوں سے لیکن پھر دونوں پھلوں میں وہ عظیم فرق ہے جس کو سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں جانتا منہا اور من یہ دونوں "من" ابتدا سے غایت کے لئے ہیں۔ کیونکہ رزق کی ابتداء جنات سے ہوئی ہے اور جنات کے رزق کی ابتداء پھلوں سے ہوئی۔ اس کو یوں سمجھئے جیسا کہ آپ کہیں کہ مجھکو فلاں نے کھلایا تو آپ سے اس پر پوچھا جائے کہ کہاں سے؟ جس کے جواب میں آپ کہیں کہ اپنے اپنے باغ سے کھلایا ہے۔ اس پر پھر سوال ہو کہ اپنے میں سے کونسا پھل کھلایا؟ تو آپ کہیں کہ اپنے باغ کے انار، بس اسی طرح کلام اللہ بھی اسی مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔ ہاں آخری بات اور یاد رکھئے کہ پھلوں سے یہاں صرف انار، سیب وغیرہ مراد نہیں بلکہ پھلوں کی متعدد اقسام میں سے کوئی خاص قسم پیش نظر ہے۔

رزقنا اصل میں رزقناہ تھا ضمیر جو عائد کا کام دے رہی تھی حذف کر دی گئی "من قبل ھذا" تھا ہذا حذف کرنے کے بعد بعد مبنی علی الضم ہو گیا بہر حال مطلب یہ ہوا کہ یہ تو وہی چیز ہے جو ہمکو پہلے دی جا چکی۔ واتوا بہ متشابہا، ارشاد ہے کہ پھل دونوں مختلف ہوں گے ہاں صرف دونوں میں صورتاً مشابہت ہوگی اتوابہ میں ضمیر دنیا اور آخرت دونوں جگہوں کے رزق کی جانب لوٹتی ہے، یہاں ایک سوال یہ ضرور پیدا ہوتا ہے

خدا تعالےٰ نے جنت کے پھل، دنیا جیسے جنس کے اعتبار سے بھی یکساں کیوں بنائے؟ حالانکہ وہ دونوں کے مختلف کرنے پر بخوبی قادر تھے۔ سو یہ اس لئے کہ انسان فطرتاً انہیں چیزوں کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ جو پہلے سے اس کے کھانے پینے پہننے وغیرہ میں آچکی ہوں ایسی چیزوں سے وہ مانوس نہیں ہوتا جو اس سے پہلے اس کے استعمال میں نہ آچکی ہوں، اور یہ بات ہے کہ جب صورت کے اعتبار سے جنتی پھلوں سے بالکل مشابہ پائے گا۔ اور استعمال کے بعد، مزہ بالکل مختلف ہوگا تو یقیناً اس کی حیرت بڑھ جائے گی۔ اور گہرے تعجب میں ڈوب جائیگا اس لطیفہ پر آپ کی نظر رہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ جو فرمایا کہ اس طرح کے کلمات جنتی ہو اس موقع پر کہیں گے جبکہ ان کو پھل کھلائیں جائیں گے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھلانے کا معاملہ اور اس پر یہ اظہار خیال بہرحال ایک ختم ہو جانے والا معاملہ ہوگا کیونکہ خدا تعالےٰ ارشاد فرما رہے ہیں کہ جب کبھی یہ بات (یعنی پھل دیئے جائینگے) پیش آئے گی اس سے معلوم ہوا کہ کچھ اوقات ایسے بھی ہوں گے جن میں یہ معاملہ نہ ہو۔

حسنؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھل جو بہشت میں دیئے جائیں گے۔ وہی آپس میں ہم جنس ہونے کے باوجود مزہ میں مختلف ہوں گے یعنی دنیا کے پھلوں سے نہیں بلکہ اتحاد جنس، اور مزہ کا اختلاف، جنت ہی کے پھلوں میں ہوگا چنانچہ حسنؒ کی روایت میں ہے کہ جنتی کے پاس طشت میں پھل پیش کئے جائیں گے وہ انکو کھائیگا۔ پھر پیش کئے جائیں گے۔ اس پر وہ بولے گا کہ یہ تو ابھی کھائے تھے، فرشتہ کہے گا کہ کھاؤ صرف صورت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں ورنہ مزہ میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے (اس روایت سے معلوم ہوا کہ سارا معاملہ جنت ہی کے پھلوں سے تعلق رکھتا ہے۔)

ایسے ہی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک اور روایت ہے آپؐ نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات گرامی کی (خدا تعالےٰ)، جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کہ جنتی اپنے ہاتھ میں پھل لے گا ابھی اس کو وہ منہ میں رکھنے بھی نہ پائے گا کہ خدا تعالےٰ بدل دیں گے۔ جب وہ دیکھے گا کہ صورت تو اس کی پہلی ہی ہے تو کہے گا کہ یہ تو ابھی کھایا تھا۔ (لیکن کھانے کے بعد مزہ مختلف پا کر سراپا حیرت بن جائے گا)

واتوا بہٖ متشابھا، یہ جملہ معترضہ ہے۔ جس سے مقصود سابق مضمون کی تاکید ہے۔

پاکیزہ صورت و سیرت بیبیاں

فرماتے ہیں کہ جنت میں اہل جنت کی بیبیاں بھی ہوں گی" ترکیب نحوی کی رو سے ازواج مبتدا ہے اور طہّر خبر ہے اور فیھا ظرف ہے۔ مطہرہ، یعنی برے اخلاق سے پاک ہوں گی۔ نہ چونڈھی اور نہ گندی یا ان میں وہ چیز نہ ہوگی جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہے یعنی حیض وغیرہ یا جو چیزیں عام طور پر پائی جاتی ہیں مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ لیکن ہیں وہ بری مثلاً پیشاب، پائخانہ وغیرہ۔ ان سے یہ بہشتی بیبیاں پاک ہوں گی۔ اور اس کے علاوہ تمام گندگیاں وغیرہ۔ ازواج، موصوف ہے اور ساتھ ہی جمع کا صیغہ، لیکن مطہرہ صفت ہونے کے باوجود مفرد ہی استعمال کیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں لغت فصیح ہیں اس لئے اس شکل میں بھی کوئی خلاف فصاحت بات نہیں ہوئی۔ اور اسی طرح طاھرۃ نہیں کہا بلکہ مطھرۃ استعمال کیا گیا کیونکہ مطہرہ میں طہارت کا مفہوم زیادہ ہے۔ بہ نسبت طاہرہ کے،

ارشاد ہے کہ یہ اہل جنت، جنت میں ہمیشہ رہیں گے، عربی لغت کے اعتبار سے خلود، ایسے قیام کو کہتے ہیں۔ جو مسلسل ہو کسی انقطاع کے بغیر۔ قرآن کریم کا یہ ارشاد جہمیہ کے قول کی تردید کرتا ہے جو جنت اور اہل جنت دونوں کے فنا ہونے کے قائل ہیں۔ دلیل یہ دیتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے اپنے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ ہم اول بھی

اور آخر بھی (ھو الاول والآخر) اولیت کے تحقق کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ سب سے پہلے ہوں اور ایسے ہی آخریت اس کے سوا اور اس کی کوئی صورت نہیں کہ وہ سب کے بعد بھی ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ سب کو فانی مان لیا جائے تاکہ وہی (اللہ تعالیٰ) باقی رہ جائیں اس لئے تمام دنیا اور خارج از دنیا جنت اہل جنت، جہنم و اہل جہنم وغیرہ سب کو فانی ماننا ضروری ہے۔ نیز یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ باقی ہیں اور ان کی تمام صفات بھی باقی ہیں۔ اب اگر جنت اور اہل جنت بھی باقی رہیں تو خالق (اللہ تعالیٰ) اور مخلوق میں مشابہت پائی جائے گی۔ حالانکہ یہ محال ہے۔ (جہمیہ کے یہ دو دلائل ہیں) اہل سنت والجماعت کا جواب یہ ہے کہ جہمیہ اوّل اور آخر کا مطلب تو سمجھے لیکن مختلف افراد کے پیش نظر اس کا علیحدہ علیحدہ مفہوم قرار نہ دے سکے، مثلاً اوّل خدا تعالیٰ کے بارے میں اس کی صورت یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ کے وجود کی کوئی ابتدا نہیں۔ جیسا کہ آخر کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی کوئی انتہا نہیں۔ اور ہمارے حق میں اولیت کا مصداق سب سے پہلا فرد اور آخریت کا سب سے آخری (اس مفہوم کے پیش نظر اب خدا تعالیٰ کو اول اور آخر ماننے کے لئے جنت اور اہل جنت کو فانی تسلیم کرنا ضروری نہ ہوگا۔

اور یہ بھی معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی جو یہ دو صفتیں بیان کی ہیں یعنی اول اور آخر تو اس سے مقصود اپنے کمال کا اظہار اور جملہ نقائص سے پاک ہونا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد خدا تعالیٰ کو حادث ہونے یا فنا ہونے سے پاک کہنے پر حاصل ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اول و آخر کی وہ تعریف قطعاً غیر ضروری ہے جو جہمیہ کہتے ہیں۔ اور یہ دلیل تو بے حد کمزور ہے کہ خالق و مخلوق میں مشابہت پائی جائے گی، کیونکہ ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے باقی بلکہ ان کا وجود ضروری ہے۔ بخلاف کسی دوسرے کے کہ اس کا بقاء خدا تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے وہ واجب الوجود ہرگز نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ اس کے بقاء کا امکان ہو سکتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا فَأَمَّا

ہاں واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کردیں کوئی مثال بھی خواہ مچھر کی ہو خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو۔ سو جو

الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ

لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں خواہ کچھ ہی ہو وہ تو یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال تو بہت ہی موقع کی ہے ان کے رب کی جانب سے۔ اور رہ گئے وہ لوگ

كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهِ

جو کافر ہو چکے ہیں۔ سو چاہے کچھ بھی ہو جاوے وہ یونہی کہتے رہیں گے وہ کون مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ

كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ ۝

بہتوں کو اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف بے حکمی کرنے والوں کو۔

الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ

جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ تعالیٰ سے کر چکے تھے اس کے استحکام کے بعد اور قطع کرتے رہتے ہیں۔

مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ نے ان کو وابستہ رکھنے کا اور فساد کرتے رہتے ہیں۔ زمین میں پس یہ لوگ پورے خسارے میں پڑنے والے ہیں

یہود کی گستاخیاں اور ان کا جواب

خدا تعالیٰ نے بعض اہم مضامین کی توضیح کے سلسلہ میں بعض مواقع پر بطور مثال، مکڑی، مکھی، وغیرہ کا ذکر کیا اس پر یہود مذاق کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اگر یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے تو اس میں ایسی حقیر چیزوں کا ذکر کیوں آتا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ "خدا تعالیٰ کو اس سے کوئی عار نہیں آتی کہ وہ مثال کے طور پر مچھر یا اس سے بھی زیادہ حقیر کسی چیز کا تذکرہ فرمائیں" مطلب یہ ہے جیسا کہ کوئی شخص کسی چیز کے حقیر ہونے کی بناء پر اس کا تذکرہ چھوڑ دے خدا تعالیٰ کو اس طرح کا کوئی عار محسوس نہیں ہوتا۔

حیا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کسی عیب کو اختیار کرتے ہوئے اپنے اندر ایک ایسی کیفیت محسوس کرے جس کے بعد اس کو کرنے کی جرأت نہ ہو۔ گویا کہ حیاء میں اثر پذیری کچھ انفعال کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ جو کہ مؤثر ہیں وہ اس طرح کا اثر کیوں قبول کرنے لگے؟ اور انکو کسی کا خوف کا ہے کو ہونے لگا؟ اس کا حل یہ ہے کہ حیاء کا لازمی نتیجہ کسی چیز کو چھوڑ دینا ہے، تو یہاں خدا تعالیٰ نے لفظ حیا بولکر، اس کا لازم یعنی ترک مراد لیا ہے۔ یعنی ہم مثال میں حقیر اشیاء کا تذکرہ ہرگز نہ چھوڑیں گے (اصطلاحی زبان میں یوں کہئے کہ لازم بولکر (حیاء) ملزوم (ترک) مراد لیا ہے۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ کفار نے لفظ یعنی حیا استعمال کیا تھا چنانچہ انھوں نے کہا تھا کہ محمدؐ تمکو ایسی ایسی چھوٹی چیزوں کے تذکرہ سے حیاء نہیں آتی" تو خدا تعالیٰ نے انہیں کے اسلوب ولہجہ میں جواب دینے کے لئے لفظ حیاء اختیار کیا ہو کیونکہ فن بدیع میں یہ بھی ایک اہم شعبہ ہے کہ سائل یا مخاطب یا معترض کے الفاظ بعینہٖ لوٹا دیئے جائیں، زبان عربی میں حیاء متعدی بنفسہٖ اور" تعدیہ بالجار" دونوں طرح مستعمل ہے چنانچہ استحیتہ (متعدی بنفسہٖ کی مثال) اور استحییت منہ (متعدی بالجار کی صورت) عام طور پر کہتے ہیں۔ یہاں دونوں صورتیں ممکن ہیں۔ "ان یضرب مثلاما" میں "ما" ابہامیہ ہے جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کو اسم نکرہ کے ساتھ ملادیا جائے تو وہ اس کے ابہام کو اور بڑھا دیتا ہے اور اسی طرح اس کی تعمیم میں بھی اضافہ اس کے ذریعہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ کہیں کہ "اعطنی کتابا ما" مطلب اس کا یہ ہوگا کہ کوئی سی بھی کتاب دیدی جائے کسی کتاب کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تاکید کے لئے صلہ ہو جیسا کہ خدا تعالیٰ کے ارشاد "فبما نقضہم میثاقہم" میں ما صلہ لتاکید ہے۔ بہرحال مطلب ہر صورت میں یہ ہوگا کہ ہم مثال دینا ہرگز نہ چھوڑیں گے اور اس سلسلہ میں ہمکو کوئی عار محسوس نہ ہوگا۔

ترکیب نحوی کے اعتبار سے "بعوضۃ" یا تو مثلاً کا عطف بیان ہے یا یضرب کا مفعول۔ اور مثلاً نکرہ سے حال واقع ہو رہا ہے۔ جو اپنے ذوالحال پر مقدم ہے۔ یا دونوں مفعول ہونے کی بناء پر منصوب ہیں اس صورت میں ضرب کو جعل کے معنے میں لینا ہوگا۔ بعوض، بعض سے مشتق ہے۔ جس کے معنے کاٹنے کے آتے ہیں۔ اہل عرب کہتے ہیں کہ " بعضہ البعوض" یعنی بعوض نے کاٹا۔ کل کے کٹے ہوئے حصہ کو بھی بعض اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ کل سے کاٹ کر جدا کر لیا گیا۔ بعوض، دراصل فعول کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے جیسا کہ تطوع وغیرہ لیکن اسمیت، وصفیت پر غالب آگئی اب بجائے صفت کے، اسم کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

فما فوقہا، یعنی جس قدر مقصد کے لئے مثال دی گئی اور ظاہر ہے کہ مثال کا مقصد حقارت تھا، تو خدا تعالیٰ کو اس میں کوئی عار نہیں کہ حقیر ہونے میں اس سے بھی زیادہ کسی چیز کو اختیار فرمائیں۔ بشرطیکہ اس سے مقصد واضح ہوتا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ زیادتی جسم وجثہ میں مراد ہو گویا کہ اس سے مقصود ان کے اس تعجب

و انکار کی تردید ہے جو ان کو مکھی اور مکڑی کو مثال میں پیش کرنے سے ہوئی۔ کیونکہ ہم آپ خوب جانتے ہیں کہ بعوضۃ کے مقابل میں ذباب و عنکبوت (مکھی اور مکڑی) بہر حال بڑے ہیں شاید یہ شبہ تو آپ کو ہو نہیں سکتا کہ پستو (بعوضۃ) سے زیادہ حقیر چیز کون ہوگی جس کو پیش کر سکتے ہیں؟ یہ اس لئے کہ دور کیوں جائیے خود اس کے پر اس کے باقی جسم کے مقابل چھوٹے ہیں۔ اور اس سے بھی چھوٹی چیزیں موجود ہیں خود آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کی حقارت کی طرف توجہ دلانے کے لئے ایسی چیزوں کا ذکر فرمایا ہے۔

مومنین کی پسندیدہ عادت

کہ ان مثالوں کو سنکر جن کے دل نور ایمان سے منور ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا جو بھی اس سے مقصد ہے وہ بہر حال صحیح ہے۔ انّہٗ کی ضمیر، مثال کی طرف راجع ہے۔ حقّ، ثابت شدہ چیز کو کہتے ہیں۔ جس کا انکار نہو سکے۔ من ربّھم، ترکیب نحوی اس کی یہ ہے کہ یہ حال ہونے کی بناء پر عربی واقع ہو رہا ہے

کفّار کی بدکرداری

اور کافر تو وہ ان کو سنکر کہتے ہیں اللہ تعالےٰ کا ان کو پیش کرنے سے کیا مطلب ہے؟ مثلاً پر وقف کرنا چاہئے۔ اگر وقف نہ کیا گیا بلکہ وصل کیا تو مابعد اس کی صفت بن جائے گا۔ حالانکہ وہ صفت نہیں ہے۔ کفار کا یہ قول یعنی ماذا اراد اللہ الخ اس سے مقصود تو خدا تعالےٰ کی تحقیر ہے (والعیاذ باللہ) جیسا کہ سیدۃ عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عبداللہ بن عمرو کے بارے میں فرمایا کہ یاعجبا لابن عمرو ظاہر ہے کہ اس کلام کا مقصد عبداللہ بن عمرو کی توہین ہے۔ مثلاً یا تو حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے یا تمیز کی بناء پر جیسا کہ یہی احتمالات "ھذہ ناقۃ اللہ لکم" میں ہیں، امّا میں شرط کے معنے پائے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کے جواب میں فاء داخل کی جاتی ہے۔ اس سے کلام میں تاکید پیدا ہو جاتی ہے۔

لطائف القرآن

یہاں یہ ممکن تھا کہ امّا کو دو جگہ پر مستقلاً استعمال نہ کیا جائے۔ لیکن اس کے باوجود خدا تعالیٰ نے دونوں مواقع پر استعمال فرمایا۔ اس اسلوب سے مقصود، مومنین کی تعریف کہ وہ خدا تعالیٰ کی پیش کردہ مثالوں پر حق ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اور کفار کی مذمت کہ وہ اس امر سے کس درجہ غافل گویا کہ بالکل احمق ہیں۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے ماذا میں دو احتمال ہیں۔ ایک تو یہ کہ "ذا" اسم موصول "الذی" کے معنے میں ہو۔ اور ما استفہامیہ اس طرح یہ دو کلمے ہوں۔ اور یہ بھی ہے کہ ما، ذا کے ساتھ مرکب ہو اور کلمہ واحد کے حکم میں ہو گیا ہو۔ جس سے مقصد استفہام ہو۔ پہلی صورت میں ما، مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہوگا۔ اور ذا، اپنے صلہ کے ساتھ اس کی خبر بن جائے گی صلہ اراد ہے، عائد محذوف ہوگا۔ اور دوسری صورت میں اراد، کی وجہ سے محلاً منصوب ہوگا۔ اور عبارت یوں ہوگی کہ "ای شیء اراد اللہ"۔

ارادہ، مصدر ہے جس کا مفہوم اپنے نفس سے کوئی چیز چاہنا یا قلبی میلان۔ متکلمین کے یہاں ارادہ کا مطلب یہ ہے کہ متعدد وہ چیزیں جن کو کیا جا سکتا تھا اس میں سے بعض کو کرنا اور بعض کو چھوڑ دینا، ترک و اخذ کی اسی قوت کا نام ارادہ ہے۔ اور اہل سنت، خدا تعالےٰ کو ارادہ حقیقی کے ساتھ متصف مانتے ہیں۔ بغداد کے معتزلہ کا خیال ہے کہ خدا تعالےٰ کی صفت ارادہ، حقیقتہً نہیں ہو سکتی بلکہ جب یہ کہا جائے کہ اراد اللہ تو دیکھنا چاہیے کہ خدا تعالےٰ خود کسی کام کو کر رہے ہیں اور اس کے لئے یہ تعبیر اختیار فرمائی تو ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالےٰ نے یہ کام کیا اور اس کو ناگوار یا ناپسندیدہ قرار نہیں دیا۔ اور اگر فاعل کوئی دوسرا ہے تو مطلب صاف یہ ہے

کہ اس نے خدا تعالیٰ کے حکم سے یہ کام کیا۔

ہدایت وگمراہی فرماتے ہیں کہ کفار کے اس سوال کا جواب کہ خدا تعالیٰ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مثال میں پیش کر کے کیا چاہتے ہیں یہ ہے کہ ان مثالوں سے بہت سوں کو گمراہ کیا جاتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت عطا فرمائی جاتی ہے، یہ آیت گویا کہ تفسیر و بیان ہے ان دو جملوں کی جو اس سے پہلے گذرے یعنی فاما الذین آمنوا الخ اور اما الذین کفروا الخ جن میں خیالات زیر بحث آئے تھے کفار کے اور نظریات بیان کئے گئے تھے مومنین کے، "کثیرًا" کا تعلق دونوں فریق سے ہے یا واقعی اور حقیقی خیالات کا اظہار کرنے والے بھی بہت ہیں اور گمراہ ہونے والے بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ کیونکہ اہل ہدایت بھی بکثرت ہیں۔ اگرچہ گمراہ پسند جماعتوں کے مقابلہ میں انکی تعداد کم ہی سہی۔ اور یہ بھی ہے کہ اچھی چیز بظاہر کم ہونے کے باوجود زیادہ ہی سمجھی جاتی ہے۔

مثالیں اور ان کا مقصد بہر حال خدا تعالیٰ نے اس موقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا ہے دراصل اس سے مقصود کفار اور جاہلین کا یہ شبہ زائل کرنا ہے کہ خدا تعالیٰ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مثال میں کیسے پیش کر سکتے ہیں۔ کیونکہ مثال مقصود کسی مضمون کی وضاحت یا کسی عقلی امر کو مشاہد کرنے کی کوشش ہوتی ہے اس لئے اگر مضمون عالی ہوگا تو اس کے لئے مثال بھی عالی اختیار کی جائے گی۔ اور اگر کوئی چھوٹی سی بات سمجھانا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے معمولی چیزوں کو مثال میں پیش کرنا مناسب ہوگا۔ حق کیونکہ واضح اور کھلی روشنی ہے اس کے لئے روشنی یا نور کے الفاظ بطور مثال اختیار کئے جاتے ہیں۔ اور باطل تاریکیوں کا مجموعہ ہے سو اس کی مثال ہمیشہ ظلمت، اندھیری، تاریکی ہی سے دیجاتی ہے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے شریک، کفار نے جو قرار دیتے ہیں خود ان شرکاء کا حال ایسا حقیر ہے کہ اس سے زیادہ کوئی حقیر ہو نہیں سکتا اسی لئے ان کے ضعف، کمزوری، بے بنیادی کو سمجھانے کے لئے "مکڑی کے جالے" سے تشبیہ دیگئی۔ کیونکہ مکڑی کا جالا جتنا کمزور اور بودا ہوتا ہے شاید ہی کوئی چیز ہو۔ بہر حال مثالیں ہمیشہ مضمون کی مناسبت اور ضرورت سے اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ مضمون نگار یا کہنے والے کی شایان شان نہیں بلکہ مضمون کے حسب حال ہونی چاہئیں۔

اب رہ جاتی ہے یہ بات کہ یہ مثالیں، مومنین کے لئے ذریعہ ہدایت اور کفار کے لئے گمراہی کا باعث کس طرح بنتی ہیں، تو اسکو یوں سمجھئے کہ مومنین جب ان مثالوں کو سنتے ہیں تو فوراً انکی زبان پر یہ آتا ہے کہ "بارخدایا" آپ کا ان مثالوں سے جو مقصد ہے وہ بالکل صحیح ہے، بس یہی ٹھیک راستہ اور صحیح موقف ہے ان مثالوں کے بارے میں، خیالات کی یہی صحت ہدایت ہے۔ اور کفار سنتے تو جہالت و انکار کی راہ سے ان مثالوں میں طرح طرح کی خرابیاں نکالتے ہیں۔ جو گمراہی اور ضلالت کی خاص علامت ہے۔

تعجب تو یہ ہے کہ کفار ان مثالوں پر خدا جانے کیوں اعتراض کرتے تھے حالانکہ خود انکی عام بول چال چھوٹی چھوٹی چیزوں کی مثالوں سے لبریز تھی۔ چنانچہ مکھی سے زیادہ جری، چیونٹی سے زیادہ مستعد، چیچڑی سے زیادہ سننے والا، مچھر سے کہیں کمزور، پسّو سے بڑھکر کھانے والا، وغیرہ انکے یہاں مثالوں میں عام طور پر مستعمل تھے۔

وما یضل بہ الا الفاسقین فرماتے ہیں کہ گمراہ فاسقین کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ "یضل" کا مفعول واقع ہو رہا ہے، یہ مستثنیٰ ہونے کی وجہ سے منصوب نہیں ہے۔ فسق کا لغوی ترجمہ تو مقصد سے نکل جانا ہے۔ یا حد و شکنی، لیکن شریعت میں فسق کی حقیقت یہ ہے کہ کسی بڑے گناہ (کبیرہ) کا ارتکاب کرکے آدمی خدا تعالیٰ کی حکم شکنی کرے، معتزلہ اسی لئے "فسق" کو ایمان و کفر کے درمیان ایک مقام قرار دیتے ہیں، انشاء اللہ ان کے اس باطل نظریہ کی تردید میں آپ کو اسی کتاب میں جستہ جستہ کافی دلائل ملیں گے۔

نقض عہد ارشاد ہے کہ یہ فاسقین وہ ہیں جو خدا تعالیٰ سے کئے ہوئے عہد و پیمان توڑتے ہیں۔ لغت میں "نقض" کا مطلب

کسی چیز کی ترکیبی شکل کو توڑ دینا۔ اور عہد کسی پختہ و مستحکم وعدہ کو کہتے ہیں۔ بہر حال یہ عہد شکن کون تھے؟ تو بعض کا خیال ہے کہ یہود تھے اور بعض کہتے ہیں کہ تمام کفار عہد شکنی کا جرم کرتے ہیں۔ اور عہد اللہ کیا ہے جس کو انھوں نے توڑا؟ تو بظاہر وہ جذبہ سلیم یا فطرت سلیم ہے جو انسان کو خدا پرستی کی جانب بلاتی ہے گویا کہ خدا تعالے نے اس خدا پرستی کے مادہ کو انسان میں ودیعت کر کے ایک عہد اس سے لینا چاہا تھا اب جو شخص خدا پرستی کے خلاف راہ اختیار کرتا ہے تو وہ عہد شکنی جیسے عظیم جرم کا مرتکب ہو رہا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ عہد سے مراد یہ ہو کہ خدا تعالے نے ان سے وعدہ لیا تھا کہ جب کوئی نبی آئے گا تو یہ اسکی تصدیق کریں گے۔ اتباع کریں گے اور انکی حمایت و نصرت انکی طرف سے ہوگی اور نبی سے متعلق صفات واحوال کے تذکرے کو چھپانے کی کوشش نکریں گے (جیساکہ یہود آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے متعلق تفصیلات کو چھپا لیتے تھے) اور عہد سے یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالے نے انکو مامور کیا تھا کہ وہ باہمی خونریزی نہ کریں۔ ایک دوسرے پر ظلم نہ ڈھائیں اور صلہ رحمی کو قطع نہ کریں۔

بعض کی رائے ہے کہ اللہ تعالے نے مخلوق سے تین عہد لئے ہیں ایک تو وہ عہد ہے جو اللہ تعالے نے تمام ہی انسانوں سے لیا ہے، یعنی خدا تعالے کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ اس عہد کا ذکر واذ اخذ ربک من بنی ادم الخ والی آیت میں آیا ہے۔ دوسرا عہد جو صرف حضرات انبیاء علیہم السلام سے ہی لیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء ورسل خدا کا پیغام (رسالت) ٹھیک طرح پہونچا دیں گے، دین کو قائم کریں گے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے سرفروشانہ خدمات انجام دیں گے، اس عہد کا ذکر "واذ اخذنا من النبیین میثاقھم" آیت میں موجود ہے۔ اور ایک عہد کے مخاطب صرف علماء ہی ہیں۔ یعنی اپنی معلومات اور علوم لوگوں سے نہ چھپائیں اس کا تذکرہ ان آیات میں ہوا "واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتب الخ

عہد فرماتے ہیں کہ عہد شکنی بھی کی اور ایسے وقت میں کی کہ عہد خوب مضبوط کر چکے تھے۔ قرآن مجید نے اس موقع پر "میثاق" کا لفظ استعمال کیا ہے جو وثاقۃ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کو مضبوط کرنے کے آتے ہیں۔ میثاقہ میں ضمیر، عہد کیطرف راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالے کے عہد کو انھوں نے قبول کر لیا تھا۔ بلکہ اسکو اپنے اوپر لازم کر چکے تھے۔ اور یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ خدا تعالے نے اپنے اس عہد کو لازم کر دیا تھا۔ من ابتداء غایت کے لئے ہے۔

قطع صلہ رحمی فرماتے ہیں کہ یہ ایسے ہیں کہ جن مواقع پر انکو "صلہ رحمی" کی رعایت کرنے کے لئے حکم دیا گیا تھا اسکو انھوں نے قطع کیا۔ یعنی جن ضرورتمند اعزا واقارب کی خبر گیری کا انکو حکم تھا اس سے غفلت برتی۔ مسلمانوں سے صحیح اور استوار تعلق کا انکو حکم دیا گیا تھا بجائے مخلصانہ روش کے انھوں نے مسلمانوں کیساتھ غداری کی اور یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تمام ہی انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کے لئے ان سے مطالبہ تھا لیکن انھوں نے یہ کیا کہ بعض انبیاء پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا۔ فقہا نے امر کا مطلب یہ بتایا ہے کہ کوئی شخص ذی رتبہ، کسی چھوٹے سے کوئی کام کرانا چاہے۔ ما امر اللہ میں ما نکرہ موصوفہ ہے۔ یا پھر الذی کے معنی میں ہے۔ اور "ان یوصل" محل جر میں ہے۔ بدل واقع ہو رہا ہے ھاء سے اصل میں یوصلہ تھا یا پھر محل رفع میں ہے اس صورت میں پوری عبارت ھو ان یوصل" ہوگی۔

فساد فی الارض ارشاد ہے کہ زمین میں فساد کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو ایمان لانے سے روکتے ہیں (اور یہی خدا تعالی کی نظر میں سب سے بڑا فساد فی الارض ہے) یا ڈاکہ ڈالتے ہیں اور اس طرح بدامنی پیدا کرتے ہیں۔ پھر ارشاد ہے کہ جن لوگوں کا طریق کار یہ ہو۔ وہی نقصان میں رہتے ہیں۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے اولئک مبتدا ہے۔ ہم ضمیر فصل اسکی خبر ہے اور نقصان آخرت ان کو یہ پہونچا کہ انھوں نے صلہ رحمی کے قطع

صلہ رحمی، ایفاءِ عہد کے مقابلہ میں، نقض عہد، فساد، بمقابلہ صلاح اور خدا تعالےٰ کے عذاب کو ثواب کے مقابل ترجیح دی (اور یہ سارے اعمال آخرت کے اعتبار سے انسان کا بہت بڑا نقصان ہیں

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ٢٧

بھلا کیونکر ناسپاسی کرتے ہو اللہ کیساتھ حالانکہ تھے تم محض بے جان سو تم کو جاندار کیا پھر تمکو موت دیں گے پھر زندہ کرینگے (یعنی قیامت

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ق ثُمَّ ٢٨

پھر ان ہی کے پاس لے جائے جاؤ گے وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے

اسْتَوٰى اِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ ٢٩ ع ۹ ۳ ۴

پھر توجہ فرمائی آسمان کیطرف سو درست کرکے بنا دیئے انکو سات آسمان اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں،

یہ سب کیسے کرتے ہو؟ ارشاد ہے کہ اے کفار تم خدا تعالیٰ کا انکار کیسے کرتے ہو۔ حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا حالانکہ تم معدوم محض تھے پھر تم پر موت طاری کرے گا اور پھر اس کے بعد تم سب اسی کیطرف لوٹ جاؤ گے۔ کیف تکفرون کا مطلب یہ ہے کہ تمکو ایمان کی دعوت دینے والی بہت سی چیزیں تھیں اور کفر سے باز رکھنے والے اسباب بھی کچھ کم نہ تھے پھر آخر ایمان کو چھوڑکر، کفر اختیار کیا تو کیوں؟ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کہا جائے میاں کیا تم بغیر پروں ہی کے اڑ جاؤ گے؟ بہر حال اس کا مقصد انکار اور تعجب ہے کنتم اموا تا حال ہے اور اس سے پہلے قد، مضمر (پوشیدہ) ہے مطلب یہ ہے کہ اے کفار تم کو خدا تعالیٰ نے پیدا کیا حالانکہ تم معدوم تھے، یعنی اپنے آباء کی پشت میں ایک قطرۂ منی کی صورت میں تھے۔ اموات، میّت کی جمع ہے جیسا کہ اقوال، قول کی جمع استعمال ہوتی ہے۔ میّت اگرچہ اس کو بھی کہتے ہیں جسمیں آثار حیات قطعاً باقی نہ رہیں جیسا کہ خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "بلدۃ طیبۃ" وہ بستی جس میں آثار زندگی کا نام ونشان نہیں۔ فاحیاکم پھر تمکو رحم مادر میں زندہ کیا، ثم یمیتکم پھر وقت پورا ہوتے پر تمہاری ارواح قبض کرے گا۔ اور پھر اسکے بعد حساب وکتاب کے لئے تم کو دوبارہ پیدا کرے گا (ثم یحییکم) اور تم سب خدا تعالیٰ ہی کیطرف لوٹ جاؤ گے یعنی سزا و جزا کے لئے اور ہو سکتا ہے کہ یہ بھی مطلب ہو کہ تم کو قبروں میں زندہ کرے گا اور پھر تم خدا تعالےٰ کی طرف لوٹ جاؤ گے۔

نکتہ یہاں ایک نکتہ آپ کی خصوصی توجہات کا مستحق ہے وہ یہ کہ خدا تعالےٰ نے سب سے پہلا عطف کلمہ فاء سے کیا ہے یعنی فاحیاکم اور پھر اس کے بعد تمام کلمات عطف کے ذریعہ عطف کئے گئے، ثم یمیتکم" وغیرہ یہ کیوں؟ اس لئے کہ پہلی مرتبہ زندہ کرنا، موت کے فوراً بعد ہوگا اور موت حیات سے بہر حال موخر ہے اور دوسری زندگی بھی موخر ہی ہے بشرطیکہ نشر مراد لیا جائے اور اگر بجائے نشر، قبر کی زندگی پیش نظر ہو تو پھر اس کے مؤخر ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے اور حساب وکتاب کے لئے جمع ہونا یہ بھی، حشر ونشر سے مؤخر ہی ہے۔ اب کہ یہ ارشاد فرمایا کہ تم ان تمام معاملات کے ہوتے ہوئے کفر کیسے کرتے ہو! تو یہ اس لئے کہ یہ تمام مراحل اور نشیب وفراز، زندگی اور موت، مرنا جینا وغیرہ سب کے سب خدا تعالےٰ کی قدرت کاملہ پر بڑے مضبوط دلائل ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے خدا تعالیٰ کا انکار کوئی کیسے کر سکتا ہے؟ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ سب چیزیں تمہارے حق میں نعمت ہیں۔ اور نعمتیں تشکر یہ کی مستحق ہوتی ہیں۔

کچھ اور دلائل ارشاد ہے کہ ہم ہی نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

تمہارے نفع کیلئے پیدا کیا تم ان چیزوں سے دنیا میں بھی نفع اٹھاؤ اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا تو ظاہر ہے لیکن ان چیزوں سے آخرت کے بارے میں کیسے نفع اٹھایا جاسکتا ہے؟ تو اسکی صورت یہ ہے کہ تمام دنیا پر عبرت کی نظر ڈالی جائے۔ اور ان تمام عبرت انگیز پہلوؤں سے سبق لیا جائے جو اپنے بنانے والے کی عظیم قدرت پر شاہد ہیں یقیناً اس کے نتیجہ میں آخرت کی یاد تازہ ہوگی کیونکہ اچھی چیزوں کو دیکھکر آخرت کی کامرانیاں یاد آئیں گی اور دنیا کے مکروہات سے آخرت کے عذاب کی یاد تازہ ہوگی۔

فقہی ژرف نگاہی یہی وہ آیت ہے جس سے کرخی، ابوبکر رازی اور معتزلہ نے استدلال کیا ہے کہ تمام وہ چیزیں جن سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، مباح اور جائز ہیں یعنی اصل میں انکا استعمال جائز ہے ان کے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ "جمیعًا" حال ہونے کی بنا پر منصوب ہے ذوالحال "ما" ہے یعنی "ما فی الارض" ہیں۔

تخلیق آسمانی استواء کے معنی، اعتدال اور استقامت کے آتے ہیں۔ اہل عرب استعمال کرتے ہیں کہ "استوی العود" جب لکڑی بالکل ٹھیک ٹھیک ہوجائے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ "استوی الیہ کالسہم المرسل" جب کوئی کسی کے پاس سیدھا پہونچے ان تمام محاورات کو سامنے رکھکر، اب "استوای الی السماء" کے معنی یہ کیجئے کہ خدا تعالے زمین کی تخلیق سے فارغ ہونے کے بعد آسمان کیطرف متوجہ ہوئے؟ یہاں پر یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھئے کہ سماوات سے مراد بالائے فضا ہے، خاص آسمان ہی مراد نہیں ہے، پھر فرماتے ہیں کہ ہم نے انکو سات آسمانوں کی شکل میں بنادیا، "فسوّٰھنّ" ایک غیر مکمل کلام تھا جس کی تفسیر و تکمیل "سبع سمٰوات" سے کیگئی۔ "تسویہ" کے معنی یہ ہیں کہ خدا تعالی نے انکو (آسمانوں) اس طرح بنایا کہ ان میں کوئی کجی یا شگاف باقی نہیں رہا۔ بعض مفسرین نے تسویہ کا مطلب، تکمیل تخلیق بھی قرار دیا ہے، یعنی انکی تخلیق کو مکمل کیا، "ثم" کے استعمال سے یہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ آسمان، زمین سے بہتر ہیں۔ کیونکہ "ثم" ترتیب مراتب پر بھی دلالت کرتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا حل یہاں ایک اشکال پیش آسکتا ہے وہ یہ کہ آیات قرآنی جن میں زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہے باہم متعارض ہیں کیونکہ یہاں زمین کی تخلیق پہلے بتائی گئی اور آسمان کی بعد میں، لیکن دوسرے موقع پر اس کے مخالف بیان ہے یعنی آسمان کی تخلیق پہلے اور زمین اس کے بعد حل اس اشکال کا یہ ہے کہ زمین کا مادہ آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا اور زمین کو اس شکل و صورت میں لانے کا کام آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا، اب جہاں زمین کا پہلے ہونا ذکر ہوتا ہے تو اس سے اس کا مادہ مراد ہے اور جہاں اسکا موخر ہونا بتایا گیا ہے ان مواقع پر زمین کی موجودہ شکل و صورت ہے جو آسمان کی تخلیق کے بعد ہوئی۔

حسن سے منقول ہے کہ خدا تعالی نے زمین کو، بیت المقدس کے موقع پر ایک پتھر کی صورت میں پیدا کیا جس پر ایک دھواں تھا، اس سے لگا ہوا یا چمٹا ہوا یہ دھواں اوپر چلا گیا اور اس سے آسمان بنائے گئے اور یہ پتھر جیسی چیز نیچے رہ گئی جسکو زمین کی شکل میں بچھا دیا گیا۔ اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ "کانتا رتقا" یعنی زمین و آسمان ایک دوسرے کو چپٹے ہوئے تھے۔ ارشاد ہے کہ ہم تمام چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔ چنانچہ اسی علم کامل کا تقاضہ تھا کہ آسمان کو مستوی شکل میں بنایا اور زمین کو اس انداز پر لے گئے جو اس پر رہنے والوں کیلئے مناسب اور ضروری ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے ربّ نے فرشتوں سے کہ ضرور میں بناؤنگا زمین میں ایک نائب فرشتے کہنے لگے کیا

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ

آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اور خونریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں

وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ

اور تقدیس کرتے رہتے ہیں آپ کی حق تعالی نے ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے۔ اور علم دیدیا اللہ نے

كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ

سب چیزوں کے اسماء کا پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کردیں پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ

(یعنی مع انکے آثار و خواص کے) اگر تم سچے ہو فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں ہمکو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ ہمکو آپ نے علم دیا

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝ قَالَ یٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ

بیشک آپ بڑے علم والے ہیں حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر فہم و علم عطا فرمایا) حق تعالی نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم

اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ

بتلا دیئے ان کو آدم ؑ نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالی نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے کہتا نہ تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ

وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝

چیزیں آسمانوں و زمین کی اور جانتا ہوں جس بات کو تم ظاہر کردیتے ہو اور جس بات کو تم دل میں رکھتے ہو۔

خلیفۃ اللہ بہرحال خدا تعالے نے زمین کو پیدا کرنے کے بعد اس پر جنات کو آباد کیا اور آسمان پر فرشتوں کو لیکن جنات نے زمین پر فساد انگیزی شروع کردی خدا تعالی نے انکی سرکوبی کے لئے فرشتے بھیجے جنھوں نے جنات کو دھکیل کر جزیروں میں گھسا دیا اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کے لئے انکو مجبور کردیا، فرشتے اب خود زمین پر، جنات کے بجائے رہنے لگے۔ خدا تعالی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یہی واقعہ سنا رہے ہیں۔ ارشاد ہے کہ آپ کے رب نے فرشتوں سے اس ارادہ کا اظہار فرمایا کہ ہم زمین پر اپنا ایک خلیفہ بنانے والے ہیں،، ترکیب نحوی کے اعتبار سے اذ سے پہلے اذکر مقدر ہے جس نے اذ کو محلاً منصوب کر دیا۔ ملائکۃ، ملاک کی جمع ہے جیسا کہ شمال کی جمع شمائل آتی ہے۔ ملائکۃ کے آخر میں تا تانیث کا اضافہ ان کے مؤنث ہونے پر دلالت نہیں کرتا بلکہ یہ تاء جمعیت پر دلالت کرتی ہے جاعل جیسا کہ معلوم ہے۔ دو مفعول چاہتا ہے یہ دونوں مفعول "فی الارض خلیفۃ" ہیں ۔اعل کے معنی بنانے والا۔ خلیفہ اسکو کہتے ہیں جس کو آپ اپنے پیچھے چھوڑ جائیں یہ فعیلۃ کے وزن پر ہے لیکن فاعلۃ کے معنی دیتا ہے۔ کیونکہ فرشتے زمین پر رہتے تھے اور اب آدم ؑ اور انکی ذریت کو زمین پر آباد کرنے کی تجویز تھی تو گویا کہ آدم ؑ

خلیفہ ہوئے۔ اسلئے خلیفہ کا لفظ استعمال فرمایا۔

اور اگرچہ خلیفہ انسان ہے صرف آدم علیہ السلام ہی نہیں۔ تاہم آدمؑ کا خصوصی تذکرہ اسلئے آیا کہ وہ ابو البشر ہیں گویا سبکے انکے ذکر کے بعد، انکی اولاد اور نسل کا ذکر ضروری نہیں رہتا جیسا کہ آپ قبیلہ کے مورث اعلیٰ کا نام لینے کے بعد دوسروں کے نام لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اور ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کا قائمقام مراد ہو تو ظاہر ہے کہ اس وقت ان کا قائمقام صرف آدمؑ ہی تھے، بہت ممکن ہے کہ خلیفہ کو واحد ذکر کرنے کی یہی وجہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں مخلوق کی ایک نوع مراد ہو اسلئے لفظ جمع کے بجائے واحد استعمال کیا گیا ہو۔ یا مراد، یہ ہو کہ اللہ کا خلیفہ، کیونکہ آدم علیہ السلام ہی خداتعالےٰ کے خلیفہ تھے۔ بلکہ ہر نبی، زمین پر خداتعالیٰ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ "یاداؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" کہ اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے (داؤد علیہ السلام سے یہ خطاب واضح کرتا ہے کہ ہر نبی خداتعالیٰ کا خلیفہ ہے)

اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ خداتعالیٰ نے فرشتوں سے اپنا ارادہ کیوں ظاہر فرمایا؟ تو سمجھ میں یہ آتا ہے کہ مقصد ملائکہ کے روبرو اپنے ارادہ کے اظہار سے یہ تھا کہ وہ یقیناً اس ارادہ پر اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ جنکو قرآن مجید نے نقل کیا اس پر انکو وہ کچھ بتایا جائے گا جس کی تفصیل آرہی ہے، اور اس تمام تفصیل، یا قیل وقال کے نتیجہ میں انسانی خلافت کی حکمت، سامنے آجائے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس گفتگو کو سنانے سے مقصود، انسان کو مشورہ کی اہمیت اور اسکی ضرورت پر متوجہ کرنا ہو کہ جب باری تعالیٰ ہر طرح کے مشورہ سے قطعاً بے نیاز ہیں لیکن اس کے باوجود مشورہ کیا، تو انسان اپنے نقص عقل کیوجہ سے مشورہ کا بہت ہی محتاج ہے۔

فرشتوں کا اظہار خیال

بہرحال جب خداتعالےٰ نے فرشتوں کو اطلاع دی تو اس پر انھوں نے عرض کیا کہ "بار الٰہا زمین میں کسی ایسی مخلوق کو خلیفہ کیوں بنایا جا رہا ہے جو زمین میں فساد انگیزی کرے گا"۔ گویا کہ فرشتوں کو اس پر حیرت تھی کہ عاصی و نافرمان مخلوق کو خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے جب کہ مطیع و منقاد مخلوق موجود ہے یعنی خود فرشتے (گویا کہ فرشتے اس کا تو یقین رکھتے کہ حکمت کوئی نہ کوئی ہے ضرور کیونکہ خداتعالیٰ حکیم ہیں اور حکیم کا کوئی عمل حکمت سے خالی نہیں ہوتا لیکن خود اس حکمت کے دریافت کرنے سے قاصر رہے اسلئے سوال کیا)

اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ فرشتونکو کہاں سے معلوم ہو گیا کہ خلیفۃ اللہ، فساد انگیزی کرے گا؟ تو بہت ممکن ہے کہ اسکی اطلاع خود خداتعالےٰ نے دی ہو۔ یا لوح محفوظ میں انھوں نے انسان کی مفسدانہ فطرت کے متعلق پڑھا ہو اور یہ بھی کہ جنات کے معاملات پر اس نئی مخلوق یعنی انسان کو قیاس کیا ہو، اور دوسرا عیب انسان میں فرشتوں نے یہ نکالا کہ وہ خونریزی کریگا۔

استحقاق خلافت

انسان پر اس نکتہ چینی[ع] کے بعد فرشتوں نے اپنا استحقاق خلافت جتاتے ہوئے عرض کیا کہ "اے خدا ہم آپ کی تسبیح کرتے ہیں تقدیس کرتے ہیں مطلب یہ ہے کہ ہم زیادہ آپکی خلافت کے

ع معاذاللہ فرشتے خدا کے کسی ارادہ پر اعتراض ہرگز نہیں کر رہے تھے کہ اس طرح کا تصور اس نوری وجود سے قطعاً ناممکن ہے بلکہ یہ تو انکی کمال اطاعت کا ایک مظاہرہ تھا جیسا کہ کوئی آقا ہو اور اس کے وفاشعار ملازم جب یہ سنیں کہ ہمارے آقا نے کچھ اور نئے ملازم رکھنے کا ارادہ کیا تو وہ سمجھا کہ خدا جانے نئے آنے والے کس طرح کے ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے آقا کیلئے کوفت و اذیت کا باعث بنیں اور وہ اپنے آقا سے پوری سعادت و اطاعت کیساتھ عرض کریں کہ اے ولی نعمت ہم تو موجود ہی ہیں پھر دوسروں کی کیا ضرورت ہے، یہ نئے ملازم رکھنے پر اعتراض نہیں بلکہ اپنی وفاداری کا مظاہرہ ہے"

مستحق ہوئے، جیساکہ آپ کسی شخص سے کہیں کہ "میاں تم فلاں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہو حالانکہ میں اس کا زیادہ مستحق ہوں" "بحمدک" بھی حال واقع ہو رہا ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کی تقدیس کرتے ہیں اور ساتھ ہی حمد بھی، جیساکہ خدا تعالی نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا ہے کہ "وقد دخلوا بالکفر" یعنی وہ کافر داخل ہوئے (تو جس طرح یہاں حال کے معنی پیدا ہو رہے ہیں ایسے ہی نسبح بحمدک بھی جملہ حالیہ ہوگا، تقدیس کرتے ہیں یعنی خود کو آپ کے لئے پاک کرتے ہیں اور بعض مفسرین نے تقدیس و تسبیح کا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ خدا تعالے کو ہر نقص سے پاک کرنا، اہل عرب استعمال کرتے ہیں سبح فی الارض و قدس فیھا جبکہ کوئی روانہ ہوجائے اور دور دراز نکل جائے۔

ارشاد گرامی

فرماتے ہیں کہ فرشتوں کے اس اظہار خیال پر ہم نے فرمایا کہ "میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم قطعاً نہیں جانتے۔ یعنی انسان کو زمین پر خلیفہ بنانے میں کیا حکمتیں ہیں انکو میں جانتا ہوں یہ اسرار و حکم تم سے قطعاً مخفی ہیں۔ یعنی انسانوں ہی میں انبیاء، اولیاء، علماء ایسے پاکیزہ نفوس پیدا ہونگے۔

آدم علیہ السلام کو تعلیم

ارشاد ہے کہ اس کے بعد خدا تعالے نے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام اسماء کی تعلیم دی۔ آدم عجمی نام ہے۔ اور شاید یہ "فاعل" کے وزن پر ہے جیساکہ "آذر" اور رہا یہ کہ آدم، ادیم الارض سے مشتق ہے یا ادم سے تو یہ ایسا ہی ہے جیساکہ یعقوب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ عقب سے ماخوذ ہے ادریس درس سے اور ابلیس، بلاس سے (یعنی یہ کوئی تحقیقی امور نہیں محض خیالات ہیں) اسماء سے مراد مسمیات ہیں، گویا کہ مضاف الیہ معلوم ہونے کی بناء پر حذف کر دیا گیا کیونکہ اسماء کا ذکر میں محذوف مضاف پر دلالت کر رہا ہے کیونکہ اسم کی مسمیٰ پر ضرور دلالت ہوتی ہے مضاف الیہ کے عوض میں یہاں لام داخل کر دیا گیا یہاں مضاف الیہ کو مقدر ماننا صحیح نہ ہوگا بہرحال مطلب یہ ہوا کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مسمیات کے اسماء کی تعلیم دی، یا چیزوں کے نام بتائے گویا کہ تعلیم کا تعلق صرف اسماء سے تھا اشیاء سے تعلیم متعلق نہ تھی۔

دلیل اس کی خدا تعالے کا ارشاد ہے فرماتے ہیں کہ "انبؤنی باسماء ھولاء" یا "انبئھم باسمائھم" یعنی اے آدم مجھکو ان چیزوں کے نام بتاؤ فرشتوں کو ان کے نام بتاؤ، یہاں یوں نہیں فرمایا گیا کہ "انبؤنی بھولاء" یا انبئھم بھولاء کہ اے آدم تم مجھکو یہ بتاؤ یا ان فرشتوں کو بتاؤ بہرحال ان آیات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ تعلیم کا تعلق اسماء سے تھا، اور ان چیزوں کے اسماء کی تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالے نے حضرت آدم علیہ السلام کو وہ تمام اجناس دکھائیں جو پیدا فرمائیں تھیں اور آدمؑ کو بتایا کہ دیکھو اس جنس کا نام گھوڑا ہے اور اس کا نام اونٹ ہے، اور اس کا نام یہ ہے اور اس کا نام وہ ہے۔ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ خدا تعالے نے حضرت آدم علیہ السلام کو چھوٹی بڑی تا آنکہ معمولی معمولی چیزوں کے بھی نام بتائے۔

فرشتوں کا امتحان

ارشاد ہے کہ پھر ہم نے تمام اشیاء کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اچھا اب تم ان تمام چیزوں کے نام بتاؤ اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ ہم نے زمین پر ایک مفسد مخلوق کو خلیفہ بنا دیا گویا کہ فرشتوں کے سامنے وہ تمام چیزیں پیش کی گئیں جن کے اسماء کی تعلیم آدم علیہ السلام کو دی گئی تھی "عرضھم" میں ضمیر مذکر استعمال کی گئی کیونکہ جن چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا تھا ان میں ذی عقل بھی تھے تغلیباً ان کی رعایت سے ضمیر مذکر استعمال ہوتی ہے۔ بہرحال اس کا مقصود یہ تھا کہ فرشتوں کو اس خاص "معاملہ" میں اپنا عجز معلوم ہو جائے اور یہ بھی کہ جس کو خلیفہ بنایا جا رہا ہے اسکی خلافت سے مقصود کچھ علمی فوائد ہیں۔ جن کا حصول انسان کے علاوہ کسی اور مخلوق سے نہیں ہو سکتا۔ عہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ٦٣ پر)

فرشتوں کا اظہارِ عجز ملائکہ نے فوراً ہی اعتراف عجز کرتے ہوئے عرض کیا، کہ سبحان اللہ آپکی ذات گرامی جہل کے نقص سے پاک ہے اور آپ کی تدبیر و حکمت پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ آیت سے ایک خاص چیز یہ معلوم ہوئی کہ علم الاسماء، عبادت سے بدرجہا فائق، ایک چیز ہے بتائیے کہ جب علم الاسماء کے یہ فضائل ہیں تو آپ کا علم شریعت کے متعلق کیا خیال ہے (ظاہر ہے کہ ان کے مقابلہ میں تو کوئی بھی چیز نہیں رکھی جا سکتی " سبحانک " اسکی تقدیر " سبحت اللہ تسبیحا ") ہے یعنی میں نے اللہ تعالیٰ کی تسبیح کی، تسبیح کرنا فرشتوں نے یہ بھی عرض کیا کہ ہم کو صرف اتنا ہی معلوم ہے جو جناب نے ہمکو سکھایا۔ اور ہمارے علوم میں علم الاسماء نہیں ہے۔ آیت میں " ما " الذی کے معنی میں ہے اور علم سے مراد معلومات ہیں۔ اور واقعی آپ تو بہت جاننے والے اور نہایت دانا ہیں اسلیئے آپ کے معاملات میں خلاف حکمت اقدام کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اِرشادِ باری فرشتوں کے اس اظہار عجز کے بعد جناب باری عزاسمہ حضرت آدمؑ کیطرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا کہ آدم اچھا تم انکو ان سب چیزوں کے نام بتاؤ۔ آدمؑ نے جب تمام اسماء بیان کر دیئے تو حضرت حق جلِ مجدہ نے فرشتوں سے کہا دیکھو کیا میں تم سے نہیں کہتا تھا کہ میں ہی آسمان اور زمین کی تمام غیبیات کو جانتا ہوں اور اسکو بھی جانتا ہوں جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور اسکو بھی جس کو تم چھپاتے ہو ؎

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ

اور جب وقت حکم دیا ہم نے فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی) کہ سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے سو سب سجدہ میں گر پڑے بجز ابلیس کے اس نے کہنا نہ مانا اور

اسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ

غرور میں آگیا　اور ہو گیا کافروں میں سے　اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم　اور

زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ

تمہاری بیوی　بہشت میں　پھر کھاؤ دونوں　اس میں سے　بافراغت جس جگہ سے چاہو　اور نزدیک نہ جائیو اس

حاشیہ صفحہ ۶۳

ع یہاں پر یہ اشکال ضرور پیش آسکتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو تو اسماء کی تعلیم دی اور فرشتوں کو اس سے غافل رکھا ظاہر ہے کہ اس صورت میں امتحان، ان الضاف کی بنیادوں پر نہیں ہو سکا جو خدا تعالیٰ کے شایان شان تھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے اسماء کی تعلیم بظاہر سیدنا آدم علیہ السلام کو، ملائکہ کے سامنے ہی دی ہوگی۔ لیکن فرشتے اسکو نہیں سمجھ سکے کیونکہ اسکو سمجھنے کے لئے ایک خاص صلاحیت کی ضرورت تھی۔ اب رہ جاتا ہے یہ سوال کہ پھر حضرت آدمؑ کے سنانے پر فرشتوں کو کیسے معلوم ہوا کہ آدمؑ ان تمام اشیاء کے نام صحیح طور پر بیان کر رہے ہیں؛ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح ایک کند ذہن بچہ ایک مستعد طالب علم کے ساتھ شریک درس ہو استاد نے دونوں کو کوئی مشکل بحث سمجھائی ذہین نے اسکو سمجھ لیا اور غبی اسکو محفوظ رکھنے سے عاجز رہا لیکن جب مستعد، اسکو از بر سنائے تو کم از کم کند ذہن اتنا ضرور سمجھ جائے گا کہ میرے ساتھی نے اسکو محفوظ کر لیا ہے اور یہ اشکال کہ خدا تعالےٰ نے فرشتوں میں وہ خصوصیت اور استعداد کیوں نہ پیدا کر دی جس سے حضرت آدم سرفراز کئے گئے تھے تو یہ سوال ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کہیں کہ فلاں مرد، مرد کیوں پیدا کیا گیا اور فلاں عورت، عورت کیوں پیدا کی گئی؟ یہ فوائد حکیم الامت حضرت رحمۃ اللہ کی تھانوی

ؔ یہاں مفسرین نے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں کہ فرشتے خدا تعالےٰ سے کیا چھپاتے تھے؟ لیکن صاحب مدارک نے بہت اچھا کیا کہ تمام اقوال سے بے نیاز تفسیر کی جس سے وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ ارشاد خدا تعالےٰ نے اپنے محیط اور غیر محدود علم کا اظہار کرنے کے لئے فرمایا ہے ہرگز ضروری نہیں کہ فرشتے کچھ چھپا رہے ہوں اور خدا تعالےٰ اس پر اپنی واقفیت کا اعلان کر رہے ہوں۔

الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ○ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا

درخت کے ورنہ تم بھی ان ہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھے ہیں پھر لغزش دیدی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کیوجہ سے

مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ

سو برطرف کر کے رہا انکو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور ہم نے کہا کہ نیچے اترو تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے اور تم کو زمین پر

فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ○

تدے ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک

عظمت انسان کے سامنے فرشتوں کی جبیں سائی

ارشاد ہے کہ اس سلسلہ کا وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب کہ ہم نے فرشتوں سے کہا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، یعنی آدم کی اطاعت کریں اور انکی فضیلت و فوقیت کو عملاً بھی تسلیم کریں۔ حضرت آبی بن کعب و حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ یہ ایسا سجدہ نہیں تھا جیسا کہ نمازیں، خدا تعالیٰ کے سامنے کیا جاتا ہے بلکہ فرشتے محض احتراماً حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھک گئے تھے۔ لیکن جمہور امت کی رائے میں اس سجدہ میں بھی فرشتوں کو زمین پر پیشانی رکھدینے کا حکم تھا اور یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام ہی کو تھا یہ قول زیادہ صحیح نہیں کہ سجدہ اصل خدا تعالیٰ کو تھا اور آدم محض فرشتوں کی اطاعت اور عدم اطاعت کا امتحان لینے کے لیے سامنے کر دیئے گئے تھے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر شیطان کو سجدہ میں کیا تامل ہوتا جبکہ مقصود سجدہ حضرت حق جل مجدہ ہی کو تھا۔

ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سجدہ اب ہماری شریعت میں قطعاً منسوخ ہے کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان کو جب انھوں نے آپکو سجدہ کرنے کا ارادہ کیا تھا تو قطعاً منع فرما دیا اور آپ نے فرمایا کہ مخلوق میں سے کسی کو سجدہ کرنا جائز نہیں، سجدہ صرف خدا تعالیٰ ہی کے سامنے ہونا چاہیئے ع۱ فرماتے ہیں کہ ہمارے اس حکم پر سب نے سجدہ کیا صرف ابلیس سجدہ کے لئے تیار نہیں ہوا۔ "الا" صرف استثنار اور استثنائے مستقل کے لئے یہاں استعمال ہوا ہے کیونکہ ابلیس، فرشتوں ہی میں سے تھا۔ حضرت علی، ابن مسعود، اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی رائے یہی ہے اور ویسے بھی استثنار مستثنیٰ منہ ہی کی جنس سے ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابلیس کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ "جب میں نے تجھکو سجدہ کا حکم دیا تھا تو پھر تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا،" لیکن قول خدا تعالیٰ کے اس دوسرے ارشاد (یعنی وکان من الجن (یعنی شیطان جنات میں سے تھا) کے مخالف ہے کیونکہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیطان ملائکہ میں سے نہیں بلکہ جنات میں سے تھا۔

حل اس اشکال کا یہ ہے کہ کان، صار کے معنی میں ہے یعنی شیطان بوجہ اپنی نافرمانی کے، جنات میں سے ہوگیا، جیسا خدا تعالیٰ نے

ع۱ آپ اتنی واضح ہدایت کے باوجود آج قبروں پر سجدہ، پیروں کو سجدہ مسلمانوں کے یہاں کس بے تکلفی کے ساتھ جاری ہے۔ سجدہ تعظیمی کے پردہ میں، اپنے ان ناجائز امور کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کتنی مذموم ہے سوچنے کی بات ہے کہ سیدنا سلمان بھی اتنا ضرور جانتے ہوں گے کہ غیر اللہ کو سجدہ عبادت ہرگز جائز نہیں۔ آپ جو سجدہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کرنا چاہتے تھے بالیقین تعظیمی سجدہ ہی ہوگا لیکن آپ نے اسکی بھی مخالفت فرمادی پھر یہ تعظیمی سجدہ کی تاویلیں ان بدعت کے نام لیواؤں کے ذہنوں میں کہاں سے پہونچ گئیں۔ ایک طرف آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کے مانند بانگ دعوے اور دوسری جانب آپ کی تعلیمات سے یہ کھلی بغاوت۔

نوح علیہ السلام کے لڑکے کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ "وکان من المغرقین" یعنی وہ ڈوبنے والوں سے ہو گیا، یہ مطلب نہیں کہ پہلے ہی سے غریق تھا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ استثناء منقطع ہے۔ اور شیطان، ملائکہ میں سے نہیں بلکہ جنات ہی سے تھا جیسا کہ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت یعنی "کان من الجن" سے ثابت ہے۔ حضرت حسن و قتادہ رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے، اور یہ بھی ہے کہ ابلیس آگ سے پیدا کیا گیا اور فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔

اور نیز اس پر نظر رہنی چاہئے کہ ابلیس نے خدا تعالی کے حکم کو ماننے سے صاف انکار کیا اور کبر و غرور کا مظاہرہ کیا جب کہ ملائکہ، طبعاً مطیع و فرمانبردار ہیں جن کے بارے میں خدا تعالے ہی کا ارشاد ہے کہ" اللہ تعالی کی نافرمانی نہیں کرتے اور اس کی عبادت کرتے میں کبھی کبر انکی راہ میں حائل نہیں ہوتا۔" اس کے علاوہ ایک اور موقع پر ارشاد ہے کہ کیا تم شیطان اور اسکی نسل کو ہمارے سے قطع نظر کر کے اپنا دوست و ولی بناتے ہو" اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کی نسل نہیں ہوتی۔ جاحظ کی رائے یہ ہے کہ جنات اور ملائکہ ایک ہی جنس سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہاں ان میں جو پاکیزہ صفات ہو گیا وہ فرشتہ کہلایا، جسکی طبیعت خباثت کی آلودگیوں سے ملوث ہوئی وہ شیطان ہوا، اور درمیانی درجے والے جنات نہ جن کو ملائکہ کہا جائے اور نہ شیطان ٹھیرایا جاسکے ارشاد ہے کہ شیطان نے سجدہ سے انکار کیا اور از راہ تکبر ہمارے حکم کی تعمیل سے رک گیا نتیجۃً وہ اپنے اس انکار و تکبر کیوجہ سے زمرہ کافرین کا ایک فرد ہو گیا۔

یہاں یہ نکتہ خاص طور پر ملحوظ رہے کہ شیطان، خدا تعالے کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کیوجہ کافر ہوا ہے صرف سجدہ نہ کرنا اس کے کفر کا باعث نہیں ہے اسلئے کہ ترک سجدہ، اہل سنت والجماعت کی رائے میں کفر کا موجب نہیں ہے اگرچہ معتزلہ اور خوارج ترک سجدہ پر کفر کا حکم لگا دیتے ہیں۔ ؎

اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ خدا تعالے خوب جانتے تھے کہ ابلیس، ایمان لانے کے بعد ضرور کفر کرے گا اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ ہمیشہ سے شیطان کافر نہیں تھا، اب کافر ہوا ہے۔

آدم علیہ السلام سے ایک خطاب اور بعض احکام

ارشاد ہے کہ ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو" اسکن، سکون سے، امر کا صیغہ ہے، عرب کہتے ہیں کہ "سکن الدار" جبکہ کوئی کسی جگہ قیام کرے اور یہ بھی استعمال کرتے ہیں کہ "سکن المتحرک" جب کوئی متحرک سکون والا ہو جائے، اس "اسکن" میں خود ضمیر خطاب موجود تھی لیکن خدا تعالے نے تاکید کے لئے "انت" کو بعد میں ذکر کیا، تاکہ "وزوجک" کا عطف اس پر ہو سکے، جنت سے یہاں جنت الخلد مراد ہے، وہ جنت مراد نہیں جس کا متقین سے وعدہ کیا گیا ہے۔ الجنۃ پر الف لام، معرفہ کا ہے۔ معتزلہ کا خیال ہے یہ جنت، یمن میں ایک باغ تھا جنت نہیں جو کہ آخرت میں متقین کو ملے گی، اپنے اس نظریہ پر وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ ہمکو خوب معلوم ہے کہ جنت میں

؎ تمام دلائل معقول اور صحیح لیکن یہ دلیل سمجھ میں نہیں آئی کیونکہ شیطان کو ملائکہ میں سے ماننے والے کہہ سکتے ہیں کہ شیطان کی نسل جنات میں سے ہو جانے کے بعد ہوئی ہے، اگرچہ اسکی کوئی نسل نہیں تھی، فقیر مترجم اس کا قائل ہے کہ شیطان ملعون جنات ہی میں سے تھا لیکن اعتراض دلیل پر ہے مسلک پر نہیں۔

؎ سیدنا الامام حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک مسلمان عمر بھر نماز نہیں پڑھتا لیکن اسکے باوجود مسلمان ہی رہتا ہے اور شیطان نے ایک ہی بار سجدہ سے انکار کیا اور ہمیشہ کے لئے راندہ ہو گیا، فرق دونوں میں کیا ہے؟ پھر خود ہی فرماتے کہ فرق یہ ہے مسلمان نماز نہیں پڑھتا لیکن خدا تعالی کے حکم کو مانتا ہے بخلاف شیطان کے اس نے خدا تعالی کے حکم کو ماننے سے انکار کیا۔

خدا تعالیٰ کسی مومن کو کسی بھی حکم کا پابند نہ کریں گے اور اس جنت میں حضرت آدمؑ کو ایک حکم یعنی درخت نہ کھانے کا پابند کیا گیا یہ اسکی دلیل ہے کہ یہ وہ آخری جنت نہ تھی۔

نیز جنت میں داخل ہونے کے بعد مومن کو وہاں سے نکالا نہ جائے گا اور اس جنت سے آدمؑ نکالے گئے یہ بھی بڑا قرینہ اس حقیقت کا ہے کہ یہ وہ عالم آخرت میں ملنے والی جنت نہیں۔ معتزلہ کے ان دلائل کے جواب اہل سنت کیطرف سے یہ ہیں کہ بیشک جنت سے مومن کو ہرگز نہ نکالا جائے گا بشرطیکہ وہ اس جنت میں اپنے حسن عمل کے نتیجہ میں داخل ہوا ہو جیسا اتقیاء آخرت میں جنت میں جائیں گے، اور حضرت آدمؑ کو جنت انکے اعمال کے جزا کے طور پر نہیں ملی تھی کہ وہاں بھی نکلنے اور نہ نکلنے کو کسی قطعی فیصلہ کی بنیاد بنا لیا جائے۔ دیکھئے آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم شب معراج میں جنت ہی تشریف لے گئے اور پھر واپس ہوئے، اور یہ دلیل کہ اہل جنت کسی حکم کے پابند نہ ہوں گے صحیح نہیں کیونکہ کم از کم عرفان رب اور توحید کے تو بہر حال جنت میں بھی مکلف رہیں گے عہ

پھر فرماتے ہیں کہ ہم نے آدمؑ سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی خوب کھاؤ" یعنی جنت کے پھل، کلام سے مضاف حذف کر دیا گیا۔ "حیث" کسی مبہم مکان کے لئے آتا ہے، مطلب یہ ہوا کہ جنت کی کسی بھی جگہ سے کھاؤ، ہو کوئی پابندی نہیں۔ لیکن اس عام اجازت کے باوجود "دیکھو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا" یعنی گیہوں عہ کے درخت کے قریب اسی لئے مشہور مقولہ ہے کہ انسان سے نافرمانی کا بار بار مظاہرہ کیسے نہ ہو حالانکہ اسکی پرورش ہی نافرمانی کے درخت سے ہوئی ہے۔ یا وہ انگور کا درخت تھا کیونکہ تمام گمراہیوں کی جڑ اسی انگور سے چلتی ہے (شراب انگور) یا انجیر کا درخت تھا۔

ارشاد ہے کہ اگر تم دونوں نے اس ممنوعہ درخت کو استعمال کر لیا تو تم بھی انہیں میں سے ہو جاؤ گے جنھوں نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنے اوپر ظلم کیا یا خود کو نقصان پہونچایا عہ

ابلیس کی اغوائی کوششوں کا پہلا مظاہرہ

ارشاد ہے کہ "پس شیطان نے پھسلا دیا ان دونوں کو اس درخت کیوجہ سے" یعنی یہی درخت حضرت آدمؑ اور انکی بیوی حواؑ علیہما السلام کی ذلت، لغزش اور بھول چوک کا باعث بن گیا، گویا کہ شیطان نے اسی درخت کو ذریعہ بنایا اور ان دونوں کو خدا تعالیٰ کی ہوئی ایک ممنوعہ چیز کے ارتکاب میں الجھا دیا۔

اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ شیطان نے اس درخت کو کھلا کر آدمؑ و حواؑ کو جنت سے نکلوا دیا۔ اب یہ مسئلہ واقعی خلجان کا

عہ یہ فقیر مترجم عرض کرتا ہے کہ جنت میں داخل ہو کر نہ نکلنا، یا وہاں کسی حکم کا مکلف نہ ہونا اس جنت کے احکام عالم آخرت کے قیام کے بعد کے ہیں اور آدم علیہ السلام کے یہ واقعات تو روز ازل سے تعلق رکھتے ہیں پھر ان واقعات کو عالم آخرت میں پیش آنے والے کوائف پر قیاس کرنا کیسے صحیح ہو گا؟

عہ اس درخت کے بارے میں اگرچہ مفسرین نے کافی اقوال نقل کئے ہیں جیسا کہ دو چار اقوال کیجانب صاحب مدارک نے بھی اشارے کئے تاہم محققین کی رائے یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے درخت کی تعیین میں انسانوں کے لئے کوئی فائدہ محسوس نہیں فرمایا اگر کوئی فائدہ دنیا یا آخرت کا ہوتا تو حضرت حق جل مجدہ ضرور ذکر فرماتے اور نہ احادیث ہی میں اس درخت کے تعین کے بارے میں کوئی چیز ملی، جیسا کہ امام المفسرین ابن جریر نے لکھا ہے کہ "لم یضع لعبادہ دلیلاً علی ذلک فی القرآن ولا فی السنۃ" امام رازی نے بھی تقریباً انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے چنانچہ لکھتے ہیں کہ "ولا علم عندنا بایۃ شجرۃ کانت علی التعیین فلا حاجۃ الیضاً لی بیانہ صاحب روح المعانی کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کسی خاص درخت کو متعین نہ کیا جائے۔"

عہ مفسرین نے اس سلسلے میں گفتگو کی ہے کہ آیا اس درخت میں خود کوئی ایسی خصوصیت تھی جسکے نتیجہ میں حضرت آدمؑ استعمال کر کے برہنہ ہو گئے یا یہ محض خدا تعالیٰ کو آزمانا تھا کہ آدمؑ ہمارے حکم کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں؟ رائے دونوں طرف ہے لیکن جزم و یقین کسی طرف بھی نہیں۔

باعث ہے کہ آدمؑ خدا تعالیٰ کی شدید ممانعت کے باوجود، آخر شیطان کے بہکانے اور سکھلانے سے اس درخت کو کس طرح استعمال کر بیٹھے؟ اس سلسلے میں بعض اکابر امت کی رائے یہ ہے کہ حضرت آدمؑ نے خدا تعالیٰ کی ممانعت کو، حرمت پر نہیں بلکہ احتیاط پر مبنی ایک حکم سمجھ لیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آدم یہ سمجھتے تھے کہ ممانعت کوئی شدید قسم کی نہیں بلکہ ہلکی سی ممانعت ہے۔ اور بعض نے یہ کہا کہ حضرت آدمؑ یہ سمجھے کہ خدا تعالیٰ کسی خاص درخت کو اس جنس کے کھانے کو روک رہے ہیں حالانکہ خدا تعالیٰ اس درخت کی پوری جنس ہی سے منع فرما رہے تھے (مطلب یہ ہے کہ آدمؑ یہ سمجھے کہ گیہوں کا کوئی خاص درخت ہے جس کو خدا تعالیٰ استعمال کرنے سے روک رہے ہیں اور وہ مجھ کو بتایا نہیں گیا ہے۔ حالانکہ خدا تعالیٰ گیہوں ہی کے استعمال سے منع فرما رہے تھے، کوئی خاص درخت گیہوں کا پیش نظر نہ تھا۔

لیکن ان دونوں رائے میں بہتر رائے پہلی ہی ہے۔

عقائد کا ایک مسئلہ بخارا کے علماء کی رائے ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے زلت (لغزش) کا لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے قرآن مجید کے اس بیان سے کہ (آدمؑ سے زلت صادر ہوئی) بخارا کے علماء کی رائے کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ زلت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص سے کوئی غلطی ہوگئی حالانکہ وہ اس غلطی کا ارادہ نہیں کر رہا تھا یعنی امر کی مخالفت بلا ارادہ، چنانچہ آدمؑ سے ایسا ہی ہوا کہ خدا تعالیٰ کے ایک حکم کی مخالفت بھول کر ان سے ہوگئی حالانکہ آدمؑ خدا تعالیٰ کی مخالفت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے یہ ایسا ہے کہ چلنے والا بلا ارادہ گر پڑتا ہے، اور سمرقند کے علماء کی رائے یہ ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی لغزشوں کو زلت سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ معصیت کا لفظ ان کے بارے میں استعمال نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اچھا کام کیا اور بہت زیادہ اچھے کو چھوڑ دیا۔ افضل کے ترک پر خدا تعالیٰ کیجانب سے عتاب ہوا۔ فرماتے ہیں کہ شیطان نے آدمؑ و حواؑ علیہما السلام کو درخت کھلا کر ان نعمتوں سے محروم کر دیا جو حاصل تھیں اور ان کا وہ اعزاز جاتا رہا جو اب تک حاصل تھا، اور یہ بھی ہو سکتا کہ انکو جنت سے نکلوا دیا لیکن یہ آخری معنی اسوقت صحیح ہونگے جب کہ اس سے پہلے "عنہا" کی ضمیر کو شجرہ کیطرف لوٹا دیا جائے اس موقع پر ایک اہم بحث یہ ہے کہ شیطان جبکہ وہ سجدہ پر انکار کرنے کیوجہ سے جنت سے نکالدیا گیا تھا جیسا کہ قرآن مجید ہی نے نقل کیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کے انکار کے بعد اس سے صاف کہدیا تھا کہ "اخرج منھا فانک رجیم" کہ "او ملعون تو اس جنت سے نکل"، پھر وہ حضرت آدمؑ اور حواؑ علیہما السلام کو بہکانے کیلئے جنت میں کس طرح پہونچا؟

چنانچہ اس سلسلے میں بعض مفسرین کی رائے ہے کہ شیطان کے لئے جنت میں داخلہ کی ممانعت اکرام و اعزاز کی راہ سے کردی گئی تھی لیکن وسوسہ اندازی کے لئے وہ ہر حال میں جاسکتا تھا، اور بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ شیطان نے جنت میں جانے کا ارادہ کیا تو باب جنت پر متعین ملائکہ نے اسکو روک دیا لیکن یہ ملعون، سانپ کے منہ میں داخل ہو کر جنت میں پہونچ گیا اور بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوا اور پھر اس نے آدمؑ و حواؑ علیہما السلام کو آواز دی اور انکو پھسلانے کی باتیں کیں۔ع

ع شیطان جنت میں کس طرح پہونچا، سانپ کے منہ کا قصہ بائبل سے نقل ہو کر ہمارے مفسرین کے یہاں پہنچا اور افسوس ہے کہ ہماری روایات کا جز بن گیا حالانکہ اس میں تحقیق و صداقت قطعاً بھی نہیں۔ بلکہ مفسرین ایک اور روایت نقل کرتے ہیں جس میں شیطان، سانپ اور مور سب ہی کا تذکرہ آتا ہے خدا کا شکر ہے کہ محققین نے اس طرح کی لغویات کیطرف ذرا بھی توجہ نہیں کی اور کھل کر ایسی سب غلط روایات و اسرائیلیات پر تنقید کی ہے چنانچہ امام رازی نے لکھا ہے کہ "اعلم ان ہذا وامثالہ مما یجب ان لا یلتفت الیہ" یعنی ایسے لغو قصوں کیجانب ذرا سی بھی توجہ نہ کرنی چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ: شیطان انسان کے رگ و پے میں اسطرح جاری رہتا ہے جیسا کہ خون انکی رگوں میں دوڑتا ہے اس حدیث کے بعد پھر شیطان کے جنت میں پہونچانے اور اغواء کرنے کے لئے سانپ، مور وغیرہ کے سہاروں کے لینے کی آخر کیا ضرورت رہ جاتی ہے؟

خلد بریں سے دنیا کی اس سرزمین پر

ارشاد ہے کہ جب آدمؑ اور حوا اس طرح درخت ممنوعہ کو کھا بیٹھے تو ہم نے کہا کہ اترو تم میں سے بعض بعض کے دشمن رہیں گے۔" ہبوط، زمین پر اترنے کو کہتے ہیں اس آیت میں، خطاب آدمؑ و حوا کے ساتھ شیطان کو بھی ہے۔ بلکہ بعض مفسرین کی رائے میں سانپ کو بھی یہی حکم ملا، لیکن صحیح قول یہی ہے کہ خطاب صرف آدمؑ اور حوا ہی کو ہے۔ اب یہ اشکال ضرور ہوگا کہ پھر ان دو کے لئے جمع کا صیغہ (اهبطوا) کیوں استعمال کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ آدمؑ و حوا، کیونکہ، نسل انسان کی اصل ہیں اور تمام انسانوں کا سلسلہ انھیں سے پھیلا اس لئے ان دونوں کو، خاص اس جہت کی رعایت کرتے ہوئے جمع کے ساتھ تعبیر کیا گیا خود قرآن مجید میں اسکی دلیل موجود ہے مثلاً ایک دوسرے موقع پر قرآن مجید نے ارشاد فرمایا کہ" اهبطا منها جميعا" کہ تم دونوں اور سب، وہاں سے نکلو" ظاہر ہے کہ اس "سب" سے مراد انکی وہی نسل تھی جو دنیا میں چل کر، آدمؑ و حوا علیہما السلام سے پھیل گئی۔

پھر فرمایا کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے اس سے مراد انسانوں کی وہ باہمی آویزشیں ہیں جو عام طور پر دنیا میں ہوتی رہتی ہیں مثلاً ایک دوسرے کے خلاف شرانگیزی ایک دوسرے پر تعدی، اور ایک دوسرے کو گمراہ کرنا وغیرہ یہ جملہ "اهبطوا" کے داؤ سے حال واقع ہو رہا ہے۔ پوری عبارت یوں ہوتی کہ "اهبطوا متعادين" زمین پر اترو در انحالیکہ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے۔ ارشاد ہے کہ" تمہارے لئے زمین میں ٹھکانہ اور ایک متعین وقت تک نفع اٹھانا ہے" یعنی زندگی سے چند روزہ فائدہ اٹھانا موت تک یا دنیا کی پوری عمر یعنی قیامت تک، ابراہیم بن ادہم کہتے تھے گویا کہ دنیا کے یہ طویل رنج و غم ہم کو وراثت میں ملے ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝

بعد ازاں حاصل کر لئے آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر یعنی توبہ قبول کر لی

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ

ہم نے حکم فرمایا نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب پھر اگر آوے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت سو جو شخص

تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

پیروی کرے گا میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔

عبودیت کی گونج بارگاہ لاہوت میں

فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آدم علیہ السلام نے کچھ کلمات اپنے رب سے سیکھے جس کے نتیجہ میں خدا تعالیٰ انکی طرف پھر متوجہ ہوا اور واقعی خدا تعالیٰ تو ہیں ہی بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والے اور سراپا رحمت، مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب ان کلمات کی تعلیم و تلقین کی تو حضرت آدمؑ پوری طرح

عه یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی شفیق آقا اپنے خادم کی کسی غلطی پر برا بھلا کہہ رہا ہو۔ خادم نے شرمندگی کے ساتھ سر جھکا لیا ہو اور اپنی غلطی پر سراپا معذرت ہو کر رہ گیا ہو، اس پر آقا کا پر شفقت قلب پھر اپنے خادم کیطرف متوجہ ہوا، معاف کر دینے کا جذبہ موجزن لیکن خادم شرم و ندامت کیوجہ سے دو کلمے بھی عفو طلبی کے زبان پر نہ لا سکے، ٹھیک اس وقت میں آقا کہے" اچھا تو بتاؤ اب آئندہ تو ایسا نہ کرو گے اپنی زبان سے کہو پھر ایسا نہ ہوگا" بالکل یہی معاملہ سیدنا آدمؑ کے ساتھ حضرت غفار و غفور الرحمٰن الرحیم کا پیش آیا۔ اے اللہ! اس کائنات میں اس فقیر مترجم "انظر" سے بڑھکر آپ کا مجرم بندہ کوئی نہیں اے اللہ اے رحمٰن اے رحیم اے غفار اے غفور بطفیل سید آدم علیہ السلام میرے ایک ایک گناہ کو معاف کر دے مجھے اور دنیا قبر اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رکھئے۔ انظر شاہ ۱۹، ارمضان المبارک ۱۳۸۲ھ

متوجہ ہو کر انکو قبول کر رہے تھے اور قبول ہی نہیں بلکہ ان پر عمل بھی کیا، مکہ کے قراء آدم کو منصوب اور کلمات کو مرفوع پڑھتے تھے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ کلمات، آدم تک پہونچ گئے، وہ کلمات کیا تھے جو خدا تعالےٰ نے حضرت آدم پر القاء فرمائے قرآن ہی کے بیان کے مطابق، وہ کلمات یہ تھے "ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین" کہ اے اللہ ہم نے آپ کے امر کے خلاف کر کے خود پر ظلم کیا اگر اب آپ نے معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم دینی و دنیاوی اعتبار سے بہت ہی نقصان میں ہو جائیں گے" گویا کہ سیدنا آدم علیہ السلام کی یہ ادا کہ اپنے گناہ و جرم پر مطلع ہونے کے ساتھ بارگاہ بے نیاز میں سراپا معذرت بن گئے، نسل آدم کو ایک تعلیم ہے کہ گناہوں پر خدائے غفار و غفور کے سامنے سر نیاز جھکا کر سراپا عذر و معذرت ہو جائے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ خدا تعالےٰ کو سب سے زیادہ پسندیدہ وہ کلام ہے جو حضرت آدم نے ارتکاب گناہ کے بعد خدا تعالیٰ کی لاہوتی بارگاہ میں پیش کیا اور وہ یہ تھا۔

"سبحانک اللھم و بحمدک و تبارک اسمک و تعالیٰ جدک و لا الہ الا انت ظلمت نفسی فاغفر لی انہ لا یغفر الذنوب الا انت"

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کیا کہ "بار الہا کیا جناب نے اپنے دست گرامی سے مجھکو پیدا نہیں فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ بیشک ہم نے ہی پیدا کیا ہے آدم نے عرض کیا اور کہا آپ ہی نے میرے جسم میں روح نہیں ڈالی بے شک ہم ہی نے ڈالی، اور کیا آپکی رحمتیں آپ کے غضب پر غالب نہیں؟ کیوں نہیں بلاشبہ ہیں۔ اچھا تو کیا آپ نے مجھکو جنت میں قیام کا حکم نہ دیا تھا؟ ضرور دیا تھا، پھر آپ نے مجھ کو جنت سے کیوں نکالدیا؟ ارشاد ہوا کہ تمہاری غلطی کے نتیجہ میں اچھا اگر میں اب توبہ کروں تو کیا مجھ کو پھر جنت میں داخل کر دیا جائے گا؟ آدم نے عرض کیا، ضرور ضرور بارگاہ الٰہی سے ارشاد ہوا، بہرحال خدا تعالےٰ پھر آدم کے حال پر متوجہ ہوئے رحمت و قبول کے ساتھ۔ اللہ تعالےٰ نے اس موقع پر صرف حضرت آدم کی توبہ کا ذکر کیا ہے اور حوا علیہا السلام کی توبہ کا ذکر نہیں آیا! توبہ تو انھوں نے بھی یقیناً کی، لیکن احادیث اور قرآن میں عموماً عورتوں کا مستقل ذکر بہت ہی کم ہے اکثر و بیشتر مردوں کے ضمن ہی میں ان کے واقعات و قصص ذکر کر دیئے جاتے ہیں چنانچہ یہاں پر آدم کی توبہ کے ذیل میں حضرت حوا کی توبہ بھی بیان ہو گئی۔ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم تو بہت زیادہ توبہ کے قبول کرنے والے اور اپنے بندوں پر رحمان و رحیم ہی ہیں، یہی وجہ تھی کہ آدم کی توبہ بھی قبول کر لی گئی۔

جنت سے زمین پر آنے کا مکرر حکم

ارشاد فرماتے ہیں کہ "ہم نے فرمایا کہ زمین پر سب جاؤ" "جمیعا" حال واقع ہو رہا ہے دنیا میں آنے کا یہ مکرر حکم غالباً تاکید کے لئے ہے[ع] اور ہو سکتا ہے کہ پہلی مرتبہ جنت سے آسمان دنیا پر آگئے ہوں اور دوبارہ آسمان دنیا سے دنیا میں جانے کا حکم دیا گیا ہو اور بہت ممکن ہے کہ اس نزول کا حکم ان آنے والے ارشادات سے ہو جو اب شروع ہو رہے ہیں یعنی "میری ہدایت تمہارے پاس آئے گی یعنی میں تمہاری طرف رسول بھیجونگا یا کتاب نازل کرونگا، ہدایت سے اس موقع پر کتاب مراد لینے کی دلیل خدا تعالیٰ کا وہ ارشاد ہے جو اس کے مقابلہ میں نازل ہوا یعنی" والذین کفروا و کذبوا بایتنا" تکذیب آیت کے لفظ سے متعین ہوتا ہے کہ ہدایت سے کتاب مراد تھی۔" تو جو میری اس ہدایت پر ایمان لائے گا اور اسکو قبول کرے گا مستقبل میں اسکو کوئی خوف پیش نہ آئے گا اور نہ ماضی کا انکو کوئی غم ہوگا[عہ] شرط ثانی یعنی" فمن تبع

ع یہ وعدہ پورا ہوا کہ آدم وفات کے بعد جنت میں داخل کئے گئے ہیں[عہ] شجرہ ممنوعہ کے کھانے سے جو اثرات مرتب ہو چکے تھے ان کے بعد جنت میں رہنے کی گنجائش کہاں باقی رہی۔ ہاں توبہ و انابت سے خدا تعالیٰ کی ناراضگی ضرور دور ہو گئی۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۱ پر)

ھذای" اپنے جواب کے ساتھ، جواب بن رہی ہے شرط اول یعنی "فامّا یاتینکم" شرط اول کا۔ یعقوب کہتے تھے کہ قرآن مجید میں خوف جہاں کہیں بھی آیا وہ منصوب ہی ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ

اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ

وہ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے اے بنی اسرائیل یاد کرو تم لوگ میرے ان احسانوں کو

اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ

جو کئے ہیں میں نے تم پر اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہدوں کو اور صرف مجھ ہی سے

فَارْهَبُوْنِ ۝ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ

ڈرو اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) ایسی حالت میں کہ وہ سچ تبلانے والی ہے اس

لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا

اور مت بنو تم سب میں پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر کو

وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا

اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ اور پوشیدہ بھی مت کرو

الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ

حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے ہو اور قائم کرو تم نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور دو زکوٰۃ کو

وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝

اور عاجزی کرو عاجزی کرنیوالوں کے ساتھ

مومنین کے احوال کے بعد کفّار کا تذکرہ

فرماتے ہیں "اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی وہی جہنمی ہیں اور وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔" آیت میں "اولٰئک" مبتدا، اور "اصحٰب النار" خبر ہے۔ اور یہ جملہ محل رفع میں ہے کیونکہ یہ خبر ہے "والذین" مبتدا، کی۔

بنو اسرائیل کو دعوت ایمان

ارشاد ہے کہ "اے اولاد یعقوبؑ میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیں اور مجھ سے کئے ہوئے وعدوں کو پورا کرو۔ پھر میں بھی تم سے اپنے کئے ہوئے

(حاشیہ صفحہ ۷۰) خوف کا تعلق مستقبل سے ہے اور حزن کا ماضی سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حشر میں کوئی ایسی بات پیش نہ آئے گی جو کہ صالحین کے لئے باعث رنج وغم اور سبب فکر وتشویش ہو۔ رہا اس دنیا میں تو خوف آخرت صالحین کو سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اسکی یہاں نفی بھی نہیں

وعدے پورے کروں گا اور صرف مجھ ہی سے ڈرو" اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ عبرانی زبان میں اس کے معنی، اللہ کا منتخب، یا عبداللہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ "اسرا" کے معنے عبد کے اور "ایل" اللہ کیلئے عبرانی میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی والے اسکو غیر منصرف کہتے ہیں کیونکہ اسمیں دو سبب غیر منصرف کے موجود ہیں ایک علمیت اور دوسرا عجمہ ہونا۔ ان نعمتوں سے مراد وہ ہیں جو ان کے آباء واجداد پر ہوتی رہیں۔ مثلاً فرعون کے عذاب سے انکی گلو خلاصی، فرعون کا خود ہلاک ہونا۔ گوسالہ کی پرستش، پھر اس پر خدا تعالےٰ کیطرف سے معافی۔ اور سب سے بڑی پھر یہ نعمت کہ انکو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نصیب ہوا جن کی بشارت توراۃ و انجیل میں پہلے سے دیجا چکی تھی اوفوا کا مطلب یہ ہے کہ مکمل طور پر ایفاء عہد کرو، کیونکہ وفا، پورا کرنے اور مکمل پورا کرنے کے ہی معنی میں آتا ہے، عہد سے مراد ایمان کا عہد اور اطاعت اور فرمانبرداری کی زندگی ہے جس کا ذکر اور یاددہانی ہر نبی ورسول کرتا رہا اور ہو سکتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید پر ایمان لانا مراد ہو۔

اگر تم نے اپنے وعدے پورے کئے تو میں بھی وعدہ پورا کرونگا۔ یعنی جو میری طرف سے وعدہ ہے کہ نیک اعمال پر اچھا بدلہ اور بہترین ثواب کا ہے۔ عہد ان الفاظ میں سے ہے جو عہد کرنے والے اور جس سے عہد کیا گیا ہو دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے قتادہ نے کہا کہ اس عہد کا تذکرہ قرآن مجید میں دوسرے موقع پر ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے کہ "لئن اقمتم الخ" اور احسن الجزا کا بھی ذکر ہے اور وہ یہ کہ "لاکفرن" الخ صوفیا نے کہا ہے کہ مطلب آیت کا یہ ہے کہ اس دنیا میں، اس طرح میرا عہد پورا کرو کہ میری حرام کردہ چیزوں سے بچو میں بھی اسکی جزا میں اپنے دارالنعیم یعنی فردوس بریں میں تمہاری عزت بڑھاؤنگا اور اپنی ملاقات کے شرف سے تمکو سرفراز کرونگا" آخر میں ارشاد ہے کہ مجھ ہی سے ڈرو" یہ اس لئے کہ اگر خوف ہوتا ہے تو چھوٹے، ماتحت، بڑوں اور آقا کی رعایت سے بہت سے ناجائز، ناپسندیدہ اور غیر شرعی افعال نہیں کرتے اور دیکھو" قرآن مجید پر ایمان لے آؤ حالانکہ اس قرآن پر تو تمکو جلد ہی ایمان لانا چاہیئے کیونکہ یہ قرآن ان آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو تم پر نازل کی گئیں مثلاً توراۃ وغیرہ کی۔ اور یہ تصدیق صرف توحید یا رسالت، اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض اہم پیشینگوئیاں کے شعبہ میں ہے۔" فرماتے ہیں کم از کم قرآن کے انکار میں سبقت نکرنا، یا سب سے پہلی منکر پارٹی نہ بننا، یا کافروں کی فوج نہ بننا، بہر حال مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص سب سے پہلے کافر بننے کی کوشش نہ کرے۔ سمجھانا ان آیات میں یہ چاہا ہے کہ ظالموں تم کو سب سے پہلے ایمان لانا چاہیئے تھا کیونکہ تم تو اسلام، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن مجید وغیرہ کو خوب جانتے ہو۔ "بہ" کی ضمیر قرآن مجید کیطرف راجع ہے۔

آیات اللہ کی خرید و فروخت

ارشاد ہے کہ "اے بنو اسرائیل میری آیات کو معمولی پیسوں کے عوض فروخت نکرو" مطلب یہ ہے کہ احکام الہی میں دنیا کے قلیل و حقیر منافع کے عوض تغیر و تبدل اور تحریف مت کرو۔ حضرت حسن فرماتے تھے کہ ثمن قلیل سے پوری دنیا مراد ہے کیونکہ آیات الہی کی عظمت و قیمت کے مقابلہ میں تمام دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور بعض اکابر کی رائے ہے کہ "ثمن قلیل سے مراد ان کے وہ اعزاز و اکرام ہیں جو انکو اپنی قوم میں حاصل تھے جن کے بارے میں انکو خطرہ تھا کہ اگر ہم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتے تو دنیاوی مرتبے جاتے رہینگے۔

پھر زور دیکر فرماتے ہیں کہ "صرف ہم ہی سے ڈرو" یہ دنیا کے اعزاز، منافع، جاہ و منزلت کے زوال کا خوف تمہارے دلوں میں کس طرح بیٹھ گیا حالانکہ ڈرنے کے قابل تو صرف ایک ہی ذات گرامی ہے اور وہ جناب جل مجدہ و عز اسمہ کی ہے اور بس۔

۵ - حاشیہ صفحہ ۷۳ پر

یہود کی تلبیسی کوششیں اور ان پر زبردست انتباہ

فرماتے ہیں کہ حق و باطل کو خلط ملط مت کرو اور حق کو مت چھپاؤ درانحالیکہ تم جان بھی رہے ہو" تلبیس کے معنی ہیں خلط ملط کرنا اس طرح کہ حق، حق نہ رہے اور باطل باطل نہ رہے،

بالباطل میں اگر با، صلہ کی ہے جیسا کہ "لبست الشئ بالشئ" میں تو اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ تورات میں ایسے مضامین اپنے ہاتھ سے مت لکھو جو تورات میں نازل نہیں کیے گئے۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالٰے کے نازل کردہ احکام، تمہارے خود ساختہ احکام سے خلط ملط ہو جائیں گے اور حق و باطل میں کوئی تمیز نہ رہے گی۔ اور اگر با، استعانت کی ہے جیسا کہ "کتبت بالقلم" میں تو معنی یہ ہوں گے۔ حق کو اس باطل کے ساتھ ملانے کی کوشش مت کرو جس باطل کو تم نے خود تیار کیا ہے۔ وتکتموا الحق، ترکیب نحوی کے اعتبار سے مجزوم ہے اور نہی کے حکم میں داخل ہے۔ گویا کہ تقدیر عبارت "ولا تکتموا" ہوگی۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہاں "ان" مقدر ہو اور "واو" جمع کے معنی میں ہو۔ اور پوری عبارت سے حاصل ہونے والے معنی یہ ہوں کہ اے یہود حق و باطل کی تلبیس مت کرو اور اس کے ساتھ حق کو چھپانے کی کوشش بھی چھوڑ دو۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ عرب کہتے ہیں کہ "لا تاکل السمک وتشرب اللبن" کہ بیک وقت مچھلی اور دودھ کا استعمال ہرگز مناسب نہیں لیکن اس کے باوجود، حق و باطل کا خلط ملط اور کتمان حق دونوں علیحدہ علیحدہ جرم تھے۔ کیونکہ حق و باطل کی تلبیس تو وہ تھی جو ہم نے ذکر کی یعنی تورات میں وہ ایسے احکام تیار کر کے لکھ دیتے جن کو خدا تعالٰے نے نازل نہیں فرمایا تھا اور کتمان حق یہ تھا کہ تورات میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق موجود پیشین گوئیوں کا انکار کرتے اور کہتے کہ ہماری تورات میں تو "محمد" سے متعلق کچھ بھی نہیں یا کہتے کہ یہ حکم تورات میں ہے ہی نہیں۔ فرماتے ہیں کہ حالانکہ جانتے ہو کہ تم کتمان اور تلبیس سے کام لے رہے مگر پھر یہ باتیں کرتے ہو۔ یہ اس لئے فرمایا کہ بری چیز کا ارتکاب درانحالیکہ اسکی برائی کا علم نہ ہو۔ کسی حد تک اس پر معذور ہی سمجھا جاتا ہے لیکن دیدہ و دانستہ برائی کا ارتکاب تو بڑا ہی ظلم ہے۔

نماز اور زکوۃ کا حکم

ارشاد ہے کہ "اے یہود نماز پڑھو اور زکوۃ بھی دو اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کیساتھ" مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرو۔ اور زکوۃ بھی انھیں شرائط کے ساتھ دو جن شرائط کی پابندی ادائیگی زکوۃ میں مسلمان کرتے ہیں۔ یہ معنی ہم اس لئے کرتے ہیں کہ یہود کی نماز میں رکوع نہیں، اور یہاں انکو خاص طور پر رکوع کا حکم دیا جا رہا ہے یہ اس کا قرینہ ہے کہ ان سے صرف نماز پڑھوانا نہیں ہے کیونکہ وہ نماز تو اپنے مذہب کے مطابق پڑھتے ہی تھے بلکہ نماز مسلمانوں جیسی ان سے ادا کرانا ہے حاصل یہ ہے کہ اسلام لے آؤ اور اسلام کی ہدایت کے مطابق عملی زندگی شروع کرو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رکوع سے مراد نماز ہی ہو جیسا کہ سجدہ بمعنی نماز مراد لیجاتی ہے۔ اور خاص اس حکم سے مقصود جماعت کی پابندی کیطرف توجہ دلانا ہو۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنتُمْ

کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنیکو (نیک کام سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ہے) اور اپنی خبر نہیں لیتے۔ حالانکہ

تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ

تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے اور اگر تمکو حب مال وجاہ کے غلبہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہو تو مدد لو صبر اور

قلیل و حقیر کی قید سے یہ سمجھنا ہرگز مناسب نہ ہوگا کہ بڑے منافع کی خاطر احکام اللہ میں تبدیلی کیجا سکتی ہے ایسا ہرگز نہیں بلکہ آپکا مطلب تو یہ ہے کہ تحریف و تغیر جیسا ناپاک ظلم کرتے ہو اور وہ بھی چند کوڑیوں کی خاطر۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴ پر)

الصَّلٰوةِ ط وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ

نماز سے اور بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلب میں خشوع ہے ان پر کچھ دشوار نہیں وہ خاشعین وہ لوگ ہیں

يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ع

جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ بیشک وہ اپنے رب کیطرف لوٹ جانیوالے ہیں

دیگراں را نصیحت فرماتے ہیں کہ یہ کیا غضب ہے کہ تم دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو درانحالیکہ کتاب الٰہی پڑھتے ہو سو کیا تم عقل سے کام ہی نہیں لیتے۔ گویا کہ یہودیوں کی ایک اخلاقی خرابی کیطرف: توجہ دلائی جا رہی ہے کیونکہ اخلاقاً اس سے بڑھکر اور کیا جرم ہوگا کہ آدمی دوسروں کو اچھائیوں کا حکم کرتا پھرے اور خود اسکی زندگی گناہوں سے داغدار ہو۔ واقعی ایسے افراد قابل تعجب ہیں جو اخلاقیات کے اس خوفناک مرض میں مبتلا ہوں۔ "بر" سے مراد ہر قسم کی خیر اور اچھائی ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ "صدقت وبررت" یہ بات خاص طور پر اس لئے فرمائی کہ یہود علماء کے عزیز و اقارب اگر ان سے پوچھتے کہ بتاؤ تمہارا (محمدؐ) کے بارے میں کیا خیال ہے؛ تو ان سے رازدارانہ طور پر یہ علماء کہتے کہ "ضرور ایمان لے آؤ واقعی یہ نبی آخر الزماں ہیں" لیکن خود . . . .

اس کے باوجود ایمان نہ لائے۔ اور یہ بھی تھا کہ دوسروں کو صدقہ دینے کا حکم کرتے لیکن خود کرتے تھے اور اگر صدقہ ان کے پاس آتا تاکہ وہ اسکو تقسیم کر دیں تو اسمیں خیانت کرتے۔ "وتنسون انفسکم" یعنی خود کو فراموش کردہ چیزوں کیطرح بھول جاتے، اور ان اچھی چیزوں کے کرنے کا تمکو بھول کر بھی خیال نہیں آتا۔ حالانکہ تم تورات پڑھتے ہو جس میں، قول وعمل کی مخالفت پر شدید وعید یا ارتکاب خیانت پر خدا تعالےٰ کے عذاب وعتاب کی اطلاع۔ یا جسمیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بہت کچھ موجود ہے اور پھر تم انکار کرتے ہو اور جس میں نیکیوں کے چھوڑنے پر عتاب الٰہی کا بار بار ذکر آیا ہے۔ افلا تعقلون یعنی کیا تم کو اتنی بھی عقل نہیں کہ جو کچھ تم کر رہے وہ کتنا برا کام ہے کاش کہ اس طرز عمل کا قبیح پہلو کا تصور تم سے یہ برے کام چھڑا سکتا گویا کہ یہ بہت ہی بری دھمکی ہے۔

فرماتے ہیں کہ "صبر اور نماز سے مدد چاہو" اور واقعی یہ نماز گراں ہے مگر خشوع رکھنے والوں پر نہیں۔ یعنی تمہاری جو ضرورتیں خدا تعالےٰ سے متعلق ہیں، ان پر صبر سے مدد چاہو اور نماز سے بھی اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ نماز میں نفس پر جو کچھ گرانی ہو اس پر صبر سے کام لو اور اس اخلاص کا نماز میں اہتمام کرو جو نماز میں بہت ضروری ہے۔ وساوس اور ایسے ہی شیطانی خطرات کو دل سے دور رکھو، نماز کے آداب کی رعایت، خشوع اور یہ یقین کہ ہم خدا تعالےٰ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، قلب و

ع گویا کہ ایمان کے حکم کے بعد اب عملی زندگی اختیار کرنے کیطرف توجہ دلائی جا رہی ہے اور جن احکام کا خاص طور پر یہاں ذکر آیا وہ یہود کے امراض روحانی کا مخصوص علاج بھی ہیں، چنانچہ نماز، حب جاہ کا خاص علاج ہے اور یہود حب جاہ میں ہی مبتلا تھے اس لئے آنحضورؐ کی دعوت اسلام قبول نہ کرتے تھے۔ زکوٰۃ سے حب مال کا علاج ہوتا ہے جس مال کے حصول میں لگ کر اسلام جیسی عظیم دولت سے وہ محروم ہو رہے تھے جماعت تواضع اور فروتنی کا مظہر ہے یہ جماعت یہود کے متکبرانہ خیالات پر ایک ضرب کاری لگائیگی۔

ع خاکسار مترجم کے ذہن ناقص میں اس آخری معنی کی دلیل ابھی ابھی یہ بھی القا ہوئی کہ اسلام میں رکوع میں شرکت گویا کہ پوری رکعت میں شرکت کے ہم معنی ہے یعنی ایک شخص اگر امام کو رکوع میں جا پاتا ہے، تو اسکو شرعاً پوری رکعت میں شریک سمجھا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ رکوع میں اشتراک، جماعت میں شرکت کی بنیاد بن جاتی ہے اس لئے رکوع سے مراد جماعت کوئی بعید مراد نہیں ہے۔

میں بیدار رہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ مطلب ہو کہ جو مصائب، پریشانیاں پیش آئیں ان پر صبر کرو۔ اور جب مشکلات کا ہجوم ہو تو نماز بکثرت پڑھو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی تو آپؐ نماز پڑھتے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سفر میں تھے اچانک انکے بھائی قثمؓ کے حادثہ وفات کی انکو اطلاع دی گئی ابن عباسؓ نے سنتے ہی انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ اور فرمایا کہ مصائب میں صبر اور نماز سے مدد طلب کرنا چاہیئے"۔

بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ صبر سے مراد روزہ ہے کیونکہ روزے میں بھی کھانے پینے کی پابندی و ممانعت رہتی ہے یہی وجہ ہے کہ رمضان کے مہینہ کے لئے صبر کا مہینہ (شہر الصبر) استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض علماء کا خیال ہے کہ صلوٰۃ سے دعاء مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مصائب میں صبر سے کام لو اور مصیبتوں کے دور ہونے کی خدا تعالےٰ سے دعاء کرو۔ "انھا" کی ضمیر یا تو نماز کیطرف راجع ہے یا پھر استعانت کیطرف، کبیرہ کے معنی شاق کے آتے ہیں آپ کہتے ہیں "کبر علیّ ھذا الامر" مجھ پر یہ امر شاق گزرا۔ فرمایا گیا ہے کہ نماز خاشعین کو دشوار معلوم نہیں ہوتی یہ اس لیئے کہ انکو اس اجر کا یقین ہوتا ہے جو مصائب پر صبر کرنے سے ملیگا اور "یقین اجر" مصائب کو آسان و ہلکا کر دیتا ہے۔

خاشعین کون ہیں

فرماتے ہیں کہ (خاشعین وہ ہیں) جنکو اس کا خیال رہتا ہے کہ انھیں اپنے پروردگار سے ملنا بھی ہے اور اس کا کہ انھیں اسی کیطرف واپس جانا ہے" مطلب یہ ہے کہ انکو، ثواب کے حصول کا یقین، اور اس اجر عظیم کی پوری توقع ہوتی ہے جو انکے لیئے خدا تعالےٰ کے پاس ہے۔ ظن، یقین کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اجر کا یقین رکھتے ہیں اور اسی اجر کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ جنکو اجر کا یقین نہیں ہوتا اور کسی ثواب کی توقع نہیں ہوتی تو ظاہر ہے کہ ان پر نماز و استعانت وغیرہ نہایت شاق گزرتی ہے۔ خشوع کے معنی جھکاؤ اور قلب کی شگفتگی کے آتے ہیں جیسا کہ خضوع، نرمی اور اطاعت کے معنی میں استعمال ہے لقاء کا ترجمہ، رویت بھی کہا گیا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوا کہ خاشعین خدا تعالیٰ کی رویت کا یقین رکھتے ہیں۔ "وانھم الیہ راجعون" یعنی عالم آخرت میں انسانوں کے تمام معاملات کا مالک و مختار سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہو گا

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ

اے اولاد یعقوبؑ کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو جو میں نے تمکو انعام میں دی تھی اور اس (بات) کو (یاد کرو) کہ میں نے

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ

تمکو تمام دنیا جہان والوں پر (خاص برتاؤ میں) فوقیت دی تھی اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ نہ تو کوئی شخص کسی کی طرف سے کچھ

نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا

مطالبہ ادا کر سکتا ہے اور نہ کسی شخص کیطرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے اور نہ کسی شخص کیطرف سے کوئی معاوضہ لیا

عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

جا سکتا ہے اور نہ ان لوگوں کی طرفداری چل سکے گی

اے اولاد یعقوب

ارشاد ہے کہ "اے اولاد یعقوب میرا وہ انعام یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تمہیں دنیا جہان والوں پر فضیلت دی" یہ ارشاد مکرر ہے کیونکہ اس سے پہلے بھی اسیطرح کیا جا چکا ہے اس لئے اسکو تاکید کیلئے سمجھئے "وانی فضلتکم" مطلب یہ ہے کہ میری نعمتوں کو یاد کرو اور اس معاملہ کو کہ میں نے تمکو سارے جہان پر فضیلت عطا کی تھی۔ عالمین سے مراد، لوگوں کی ایک بڑی جماعت ہے۔ جیساکہ عام طور پر کہتے ہیں کہ "رأیت عالماً من الناس" میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا، اس قول کا بھی مطلب کثیر تعداد ہی ہے عہ

"اور اے اولاد یعقوب اس دن سے ڈرو جس دن کہ کوئی کسی کا بدلہ نہیں دیسکتا، نہ کسی کی سفارش قبول کیجا ئیگی اور نہ کسی کا کوئی فدیہ لیا جائے گا اور نہ کسی کی کوئی مدد کر سکے گا۔" آیت میں جس دن کا ذکر آیا ہے وہ قیامت کا دن ہوگا۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ "یوماً" مفعول بہ واقع ہو رہا ہے ظرف نہیں پہلے نفس سے مومن مراد ہے، اور دوسرے سے کافر مراد یہ ہے کہ کوئی مومن کسی کافر کا بدلہ نہیں بن سکے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کافر پر کچھ حقوق عائد ہیں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ مومن کچھ دے دلا کر اس کافر کو چھڑا لے، آیت میں شیئاً، یا تو مفعول ہے یا پھر مصدر ہی مصدر ہونے کی صورت میں معنی ہوں گے کہ جزا کا تھوڑا سا بھی حصہ قبول نہ کیا جائے گا اور ترکیب کے اعتبار سے پورا جملہ بھی نصب میں ہے کیونکہ "یوماً" کی صفت واقع ہو رہا ہے۔ موصوف کیجانب لوٹنے والی ضمیر محذوف ہے تقدیر عبارت یہ ہے "لاتجزی فیہ" لا یقبل کی ایک قرات تا کے ساتھ بھی ہے یعنی لا تقبل منہا کی ضمیر نفس مومن کیجانب راجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی مومن کسی کافر کی شفاعت کرنا چاہے گا تو ہرگز قبول نہ ہوگی۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ یہود کو یہ بہت بڑا زعم تھا کہ ہمارے آبا و اجداد جو انبیاء ہوئے ہیں ہماری تمام سیاہ کاریوں کے باوجود شفاعت کریں گے اور انکی شفاعت ہمارے لئے نجات و گلو خلاصی کا باعث بن جائیگی عہ۔

قرآن مجید نے ان آیات میں انکی انہیں غلط تمناؤں پر تنقید کی ہے اور اس سلسلے میں قطعاً مایوس کر دیا۔ یہ ایسا ہی ہے جیساکہ ایک دوسرے سے توقع پر قرآن مجید نے ارشاد فرمایا ہے کہ "فما تنفعہم شفاعۃ الشافعین" کہ انکو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع نہ پہونچائے گی۔

شفاعت اور معتزلہ کی غلط رائے

انھیں آیات کو سامنے رکھکر معتزلہ نے رائے قائم کی ہے کہ مومن اگر کسی گنہگار مسلمان کی بھی شفاعت کریگا تو وہ بھی قبول نہ ہوگی، معتزلہ کی یہ رائے قطعاً غلط ہے کیونکہ آیت میں جس شفاعت کے نہ قبول کرنے کی اطلاع ہے وہ تو مومن کی شفاعت کافر کے حق میں ہے، رہ گئی شفاعت مومن کی مومن کے حق میں اس کا آیت میں کوئی تذکرہ ہی نہیں اور احادیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اپنی امت کے بڑے بڑے گنہگاروں کی شفاعت کروں گا اور جو اس کا انکار کرتا ہے تو وہ میری شفاعت

عہ اس عبارت سے صاحب مدارک اصل میں ایک بڑے اشکال کو حل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ اگر بنو اسرائیل کو، سارے جہان پر فضیلت ہے تو پھر یقیناً امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر بھی ہوگی حالانکہ قرآن مجید ہی میں اس امت کو "خیر الامت" کا لقب دیا گیا اور احادیث تو اسکی فضیلت سے لبریز ہیں، صاحب مدارک کا جواب یہ ہے کہ جم غفیر مراد ہے پورا عالم مراد نہیں اور جس جم غفیر پر بہود یوں کو فضیلت دی گئی تھی اسمیں امت محمدیہ داخل ہی نہیں، کیونکہ انکو فضیلت دی تھی اس وقت امت محمدیہ تھی ہی نہیں۔ اور یہ بھی جواب ہو سکتا ہے کہ بنو اسرائیل کی فضیلت نسلی اعتبار سے ہے جبکہ امت محمدیہ کی فضیلت، دین و عقیدہ کی رو سے ہے چنانچہ قرطبی کی اس پر نظر ہے انھوں نے اس اشکال کو حل کرنے کے لئے لکھا ہے کہ "بما جعل فیہم من الانبیاء وھذا خاصۃ لہم ولیست لغیرہم" یعنی انکو فضیلت صرف اتنی ہے کہ ان میں انبیاء بکثرت پیدا ہوئے ورنہ دین و عقیدہ کے اعتبار انکو کوئی فضیلت نہیں ہے

سے محروم رہے گا۔

عدل سے مراد فدیہ ہے، ولا ھم ینصرون، یعنی ایک دوسرے کے ساتھ قیامت میں کوئی ہمدردی وحمایت کا معاملہ بھی نہ کر سکیں گے،

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ رہائی دی ہم نے تمکو متعلقین فرعون سے جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری سخت آزاری کے

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ

گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد ذکور کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو اس (واقعہ) میں ایک امتحان تھا

بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ

تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑا بھاری اور جب شق کر دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریائے شور کو پھر بچنے (ڈوبنے سے)

وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى

بچا لیا تمکو اور غرق کر دیا متعلقین فرعون کو (مع فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کر رہے تھے اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ وعدہ کیا تھا ہم نے

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝

موسیٰؑ سے چالیس رات کا (زمانہ ہو گیا تھا) پھر تم نے تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰؑ کے (جانے کے بعد) اور تم نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

پھر بھی ہم نے (تمہارے توبہ کرنے پر) درگذر کیا تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب دی ہم نے موسیٰؑ کو کتاب (توریت) اور فیصلہ کی چیز اس توقع پر کہ تم راہ پر چلتے رہو۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا اپنی قوم سے کہ اے میری قوم بیشک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اپنے اس

بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ

گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو پھر بعض آدمی بعض کو قتل کرو یہ (عملدرآمد)

ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ ھُوَ التَّوَّابُ

تمہارے لئے بہتر ہوگا تمہارے خالق کے نزدیک پھر حق تعالے تمہارے حال پر اپنی عنایت سے متوجہ ہوئے بیشک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں

الرَّحِيْمُ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ

اور عنایت فرماتے ہیں اور جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہارے کہنے سے یہاں تک کہ ہم (خود) دیکھ لیں اللہ تعالیٰ کو

جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ
علانیہ طور پر سو اس گستاخی پر آ پڑی کڑک بجلی اور تم (اس کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے پھر ہم نے تمکو زندہ اٹھایا

مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝
تمہارے مرجانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

بنو اسرائیل پر انعامات کی ایک طویل فہرست

فرماتے ہیں کہ وُہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب کہ ہم نے تمکو فرعون والوں سے نجات دی تھی جو تمہارے اوپر بڑا عذاب توڑ رہے تھے، تمہارے لڑکوں کو قتل کرڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کیطرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔" اھل، گویا کہ اصل ہے لفظ آل کی، عربی قاعدہ کے مطابق کسی لفظ کی تصغیر اس کے اصل پر دلالت کرتی ہے چنانچہ آل کی "اُھیل" آتی ہے اور یہی اس بات کا سب سے بڑا قرینہ ہے کہ "آل" اصل میں اھل تھا۔ گویا کہ اسکی ھا، فا، سے بدل گئی۔ یہ لفظ ہر ایک کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ عموماً بڑوں ہی کے لئے اس کو استعمال کرتے ہیں۔ جیساکہ بادشاہوں کے لئے یا اس حیثیت کے دوسرے آدمیوں کے لئے۔ فرعون عمالقہ کے بادشاہوں کا لقب ہے کسی خاص شخصیت کا نام نہیں ہے جیساکہ روم کے بادشاہوں کے لئے قیصر اور فارس کے بادشاہوں کے لئے کسریٰ استعمال ہوتا ہے۔ یسومونکم آل فرعون سے حال واقع ہو رہا ہے۔ اس کے معنی ظلم کرنے کے آتے ہیں

اہل عرب "سام سلعۃ" اور "سام حنسفا" ظلم کے معنی میں لیتے ہیں۔ "سوء العذاب" سے معلوم ہوا کہ طرح طرح کی تکالیف پر عذاب کی زیادتی ادا کرتے۔

ترکیب کے اعتبار سے سوء، یسومونکم کا مفعول ثانی ہے، سوء، مصدر ہے کہتے ہیں کہ "اعوذ باللہ من سوء الخلق" یا "اعوذ باللہ من سوء الفعل" یعنی میں بُرے اخلاق یا بُرے کاموں سے پناہ مانگتا ہوں۔ یہاں سوء العذاب سے مراد سخت قسم کی تکالیف ہیں۔ یذبحون ابناءکم اس عذاب کی تفصیل ہے یعنی فرعون، اسرائیلیوں پر جو عذاب کرتے تھے اسکی تفصیل یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں کہ تمہاری اولاد ذکور یعنی بیٹوں کو فرعونی قتل کر رہے تھے اور تمہاری اولاد اناث یعنی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے (اور وہ بھی کسی اچھے مقصد و نیت سے نہیں بلکہ خدمت لینے کے لئے) فرعون نے یہ معاملہ بنو اسرائیل کے ساتھ اس لئے کیا تھا کہ کاہنوں نے فرعون سے کہا تھا کہ بنو اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری بادشاہت کو ختم کرے گا۔ جیساکہ اس طرح کی بات نمرود سے کہی گئی تھی۔ لیکن یہ احتیاطی تدابیر سب بے کار گئیں اور وہی ہو کر رہا جو خدا تعالے نے فیصلہ فرما دیا۔ (یعنی فرعون بھی اسی طرح ہلاک ہو گیا جیسا کہ نمرود کی حکومت ختم کر دی گئی تھی) ؎

فرماتے ہیں کہ اس معاملہ میں تمہارے لئے بڑی آزمائش تھی، معاملہ سے کیا مراد ہے؟ کہتے ہیں کہ اگر فرعون کے اس اقدام کیطرف اشارہ ہے جو وہ بنو اسرائیل کی اولاد کے ساتھ کرتا تھا تو گویا کہ یہ مصیبت من جانب اللہ تمہارے لئے ایک آزمائش تھی، اور اگر یہ مراد لی جائے کہ خدا تعالے نے تمکو فرعون کی اس لائی ہوئی مصیبت سے بچالیا تو گویا کہ تم پر جو یہ

؎ جیوش ان سائیکلو پیڈیا میں آج تک یہود کی یہ خوش خیالی ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے کہ بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے لوگ اپنے اخلاف کے اعمال حسنہ کی بنا پر بخش دیئے جائیں گے" جلد ۶ صفحہ ۶۱ قرآن مجید نے انھیں خیالات کی تردید کی ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا ۷۹ پر

انعام کیا گیا اس میں ایک بڑی آزمائش تھی (کہ دیکھیں خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کرتے ہو یا نہیں) ترکیب کے اعتبار سے من ربکم بھی صفت ہے اور عظیم صفت ثانی ہے۔

پھر فرماتے ہیں کہ "وہ واقعہ بھی یاد کرو جبکہ ہم نے تم کو بچانے کے لئے دریا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا (جس کے نتیجہ میں) تم کو ہم نے نجات دی اور فرعون والوں کو ہلاک کر دیا، تم خود بھی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے" (یعنی دریا کو دو حصوں میں تقسیم کر کے درمیان میں خشک راستہ" بنو اسرائیل کے گزرنے کے لئے بنا دیا گیا تھا۔ یہ بارہ راستے تھے جو اسرائیلیوں کے قبائل کی تعداد کے مطابق تھے۔ دریا کا کٹ کر اسرائیلیوں کے لئے راستہ کا تیار ہو جانا خود اسرائیل کے مشاہدہ میں آچکا تھا جس میں انکو شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسی لئے ذکر فرمایا کہ تم یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے[۱]

گوسالہ پرستی

فرماتے ہیں کہ "وہ اور واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے موسیٰ سے چالیس دن کا وعدہ کیا پھر تم نے اسکے بعد گوسالہ کی پرستش شروع کر دی اور تم اس (گوسالہ پرستی) میں حد سے تجاوز کرنے والے تھے"[۲]

خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی یہ وعدہ فرمایا تھا کہ تم اے موسیٰ طور پہاڑ پر آؤ، یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب فرعون ہلاک ہو چکا تھا اور اسرائیلی مصر میں مقیم تھے۔ ان کے پاس کوئی ایسی کتاب یا صحیفہ آسمانی نہیں تھا جس پر وہ عمل کر کے خدا تعالیٰ کی پسندیدہ زندگی گزاریں انھوں نے اس سلسلے میں خود سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے لئے کوئی ایسا صحیفہ

سے یہ روایت کہ فرعون نے خواب دیکھا تھا اور منجمین کی تعبیر پر بنو اسرائیل کے لڑکوں کو اس نے قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، خاکسار کو الحمدللہ دارالعلوم دیوبند میں دس سال سے زیادہ قرآن مجید کی تفسیر کرتے ہوئے گزر گئے، دوران درس میں یہ روایت ہمیشہ زیر بحث آئی لیکن قلب قبول نہ کرتا۔ مگر تردید کے لئے کوئی قابل اعتماد روایت بھی سامنے نہ تھی۔ بحمداللہ اب علامہ رشید رضا مرحوم مصری کی تفسیر المنار مطالعہ سے گزری تو انھوں نے اپنے امام واستاذ شیخ جمال الدین کی تحقیق نقل کی ہے کہ یہ روایت قطعاً صحیح نہیں ہے۔ بلکہ دشمن قوم کی نسل کو ختم کرنے کی جو خوفناک سازش ہمیشہ سے چلتی رہی اسی کے ماتحت فرعون نے بنو اسرائیل کے ساتھ یہ اقدام کیا تھا۔ علامہ مرحوم نے لکھا ہے کہ صدیوں کی غلامی کے باوجود بنو اسرائیل میں حریت پسندی کی خو بو خطرناک حد تک موجود تھی۔ سوچ سمجھ کر انکو ذلیل کرنے کیلئے یہ تدبیر فرعون نے نکالی تھی۔ الفاظ علامہ کے یہ ہیں۔

"قال الاستاذ الامام ولیس لهذا القول سند صحیح ولا یعرف فی التاریخ" المنار جلد اول ص ۳۱۳

[۱] یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب خدا تعالیٰ نے فرعون کیطرف سے مایوس ہو کر کہ وہ ایمان قطعاً نہ لائے گا۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ وہ اسرائیلیوں کو لیکر مصر سے نکل جائیں اور اپنے باپ دادا کی سرزمین فلسطین میں چلے جائیں۔ خدا تعالیٰ کے حکم پر حضرت موسیٰ نے اسرائیلیوں کو چپکے سے نکلنے کا حکم دیا اور رات ہی کو بحر احمر کے راستہ پر ہو لئے۔ پرچہ نویسوں کو کسی طرح اطلاع ہو گئی تو انھوں نے فرعون کو خبر دی، فرعون یہ سنتے ہی ہزاروں کی فوج لے کر تعاقب کے لئے نکلا، اسرائیلیوں نے اپنے پیچھے جم غفیر آتے دیکھا تو ڈر گئے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا ڈرو نہیں خدا تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ خدا تعالیٰ کے حکم سے عصا پانی پر مارا تو اس میں خشک راستہ تیار ہو گیا۔ فرعون بھی پیچھے سے اترا لیکن بنو اسرائیل سب بچکر نکل گئے اور فرعونی سب کے سب غرق ہو گئے۔

[۲] سیدنا موسیٰ علیہ السلام گو کہ اپنی عدم موجودگی میں حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا قائمقام بنا گئے تھے، اور وہ برابر تبلیغ وارشاد وہدایت فرماتے رہے۔ لیکن سامری جو کہ ایک گمراہ اسرائیلی تھا، اسرائیلیوں کی گمراہی کا ذریعہ بنا اور اس نے سونے کے زیورات کو ڈھالکر ایک بچھڑا بنایا اور اس میں حضرت جبرئیل کی سواری کے پاؤں کے نیچے کی مٹی جو سامری کے ہاتھ لگ گئی تھی استعمال کر کے بنایا کہ یہی معاذاللہ خدا ہے حضرت ہارون کی تمام کوششیں غیر موثر رہیں۔

لائیے جس میں خدا تعالیٰ کی مطلوب زندگی گزارنے کے احکام درج ہوں۔ اس پر خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تورات کے نازل کرنے کا وعدہ فرمایا کہ ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے اس دن میں (مجموعہ چالیس دن) یہ کتاب مقدس آپ پر نازل کیجائیگی، آیت پاک میں اگرچہ ذکر صرف راتوں کا آیا ہے، لیکن مراد دن اور رات دونوں ہیں اور اربعین، وعدنا کا ثانی مفعول ہے ظرف نہیں، اس لئے کہ ظرف کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ چالیس راتوں میں یہ وعدہ کیا گیا تھا حالانکہ یہ غلط ہے۔ بہرحال جب سیدنا موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے تو یہودیوں نے ایک بچھڑے کی پرستش شروع کردی اور سامری کے کہنے سے اسکو اپنا خدا بنالیا۔ العجل کے بعد الہا محذوف ہے مطلب یہ ہے کہ بچھڑے کو بطور خدا کے تجویز کرلیا۔ من بعدہ، یعنی حضرت موسیٰ کے طور پر تشریف لیجانے کے بعد۔ فرماتے ہیں کہ اے یہود تم نے یہ نامناسب اقدام کرکے کہ خدا کی ایک مخلوق یعنی بچھڑے کو (سلہ) کو خالق بنالیا، بڑا ہی ظلم کیا، جملہ حالیہ ہے یعنی تم اس تجویز میں بالکل ہی ظلم کررہے تھے۔ لــه

ارشاد ہے لیکن ہم نے تمہاری اس لغو حرکت کے باوجود پھر تمکو معاف کردیا اور مقصد اس معافی کا یہ تھا کہ شاید تم اب شکر کروگے کہ خدا تعالےٰ ایسے غفار غفور اور ارحم الراحمین نے ہمارے شرک و کفر جیسے گناہ کو بھی معاف فرمادیا۔

تورات

فرماتے ہیں کہ وہ احسان بھی قابل تذکرہ ہے جبکہ ہم نے موسیٰ کو تورات عطا کی جو حق و باطل میں فرق کرنے والی تھی (فرقان) جس کا مقصد صرف تمہاری ہدایت تھی" یہاں تورات کی دو صفات ذکر فرمائیں ایک اسکا کتاب ہونا اور دوسری اسکی اہم ترین صفت فرقان ہونا، گویا کہ وہ منزل من اللہ صحیفہ بھی تھا اور حق و باطل میں خط کھینچ دینے والا۔ نوشتہ الٰہی بھی یہ دونوں خوبیاں بیک وقت اسمیں جمع تھیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ کہدیں کہ میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو شیر بھی تھا اور بادل بھی" لرائت اللغیث واللیث مطلب یہ ہوگا کہ سخاوت اور شجاعت دونوں اوصاف اسمیں موجود تھے۔

اور ہوسکتا ہے کہ فرقان سے مراد وہ معجزات ہوں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیئے گئے تھے یعنی عصا، ید بیضا وغیرہ جن کو دیکھنے کے بعد ایمان و کفر میں امتیاز باسانی کیا جاسکتا تھا اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ موسیٰ کو تورات بھی دی گئی اور ساتھ ہی معجزات قاہرہ بھی۔ اور بعضوں نے فرقان سے مراد شریعت لی ہے جو حرام و حلال میں فرق کرتی ہے گویا کہ تورات بھی عطا کی گئی اور ساتھ ہی ایک مستقل شریعت بھی۔ ایک نہایت بعید قول یہ بھی ہے کہ فرقان سے مراد دریا کا پھٹنا اور اسرائیلیوں کو گزرنے کی جگہ دینا وغیرہ مراد ہے جس کے نتیجہ میں موسیٰؑ اور ان کے دشمنوں میں تفریق و جدائی ہوگئی بہرحال کچھ بھی ہو نزول تورات کا مقصد اسرائیلیوں کی ہدایت تھی جیسا کہ ارشاد ہے" لعلکم تهتدون"

گوسالہ پرستی اور پیغمبر کا انتباہ

فرماتے ہیں وہ بھی یاد کرو کہ جب موسیٰ (طور سے لوٹ کر آئے) اور تم سے کہا کہ اے میری قوم تم نے گوسالہ پرستی کرکے بڑا ہی ظلم کیا اب تم اپنے خدا کے سامنے توبہ کرو جس کی صورت یہ ہوگی کہ تم ایک دوسرے کو قتل کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے پھر جب تم نے توبہ کی) تو خدا تعالےٰ نے پھر تمہاری طرف توجہ کی اور واقعی خدا بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والے اور سراپا رحمت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ان لوگوں سے تھا جنھوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی۔ باری خدا تعالیٰ کا نام ہے جس کے معنی خالق کے آتے ہیں جسکی خلق میں کوئی تفاوت اور فرق نہ ہو۔ لفظ باری اس موقع پر نہایت برمحل ہے اپنے تمام ہی اسماء کو چھوڑ کر خاص طور پر اسکو اس لئے انتخاب فرمایا تھا کہ یہودیوں کو معلوم ہو کہ انھوں نے باری ایسے حکیم، علیم، خالق کو چھوڑ کر ایک بچھڑے کی پرستش اور عبادت کی حالانکہ گائے اور اس کی تمام نسل حماقت میں ضرب المثل ہے۔

"فاقتلوا انفسکم" کا ایک تو مطلب یہ ہے کہ اپنے ہاتھ سے خود کو ہلاک کریں۔ اور دوسرے معنی یہ بھی لئے گئے ہیں کہ ایک دوسرے کو قتل کریں اور تیسرا مطلب اس کا یہ بھی بتایا گیا ہے کہ عبادت کرنے والوں کو قتل کریں اور قتل کرنے والے وہ ہوں جنھوں نے گوسالہ

لــه حاشیہ ۹۷ پر

پرستی میں حصہ نہیں لیا تھا۔ بہر حال بنو اسرائیل ستر ہزار کے قریب قتل ہوئے۔

فرماتے ہیں کہ توبہ کے طور پر یہ قتل اپنے گناہ پر اصرار سے بہتر ہے تو اب وہ ذات گرامی جو گناہوں کی کثرت کے باوجود توبہ قبول کرلے اور رحیم وہ سراپا رحم ذات ستودہ صفات جو گناہوں کے باوجود بڑے ہونے کے (کبیرہ) معاف فرمادے۔ اس آیت میں تین جگہ فاء آئی ہے پہلے "فتوبوا" پس پھر "فاقتلوا انفسکم" اور تیسرا و آخری موقع فتاب علیکم" ہر موقع پر اس کے علیحدہ معانی ہیں۔ آیت میں پہلے موقع پر فاء بتاتی ہے کہ توبہ، گناہ کے بعد ہونی چاہیئے۔ اور دوسری مرتبہ کی فاء بتاتی ہے کہ اب توبہ کرو جبکہ تم نے گوسالہ پرستی کا جرم کیا، گویا کہ یہ فاء تعقیب پر دلالت کرتی ہے جیساکہ پہلی سبب پر دلالت کر رہی تھی۔ اور تیسری فاء ایک شرط محذوف کے متعلق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اے یہود تم نے ہمارے ارشاد کے مطابق توبہ کی اور اسی طریقہ پر جو توبہ کا ہمنے متعین کیا ہے یعنی "قتل" تو اللہ تعالیٰ پھر تمہارے حال پر توجہ فرمائے گا۔ع

ایک گستاخانہ مطالبہ

فرماتے ہیں کہ وہ واقعہ قابل ذکر ہے جبکہ تم نے اے یہود موسیٰ سے کہا کہ اے موسیٰ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے تاوقتیکہ خدا تعالیٰ کو ہم علانیہ نہ دیکھ لیں، سو اس پر تمکو آلیا کڑک نے اور تم اس کا آنا دیکھ رہے تھے" جہرۃ کے معنی عیاناً کے ہیں ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ مصدر ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور ہو سکتا ہے کہ حال ہونے کی بناء پر اس پر نصب آیا ہو۔ صاعقہ سے بعض مفسرین نے موت مراد لی ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ صاعقہ ایک آگ تھی جو آسمان سے اتر کر آئی تھی جس نے انکو جلا دیا تھا۔ اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام جس وقت پہاڑ پر تشریف لیجا رہے تھے تو انکے ساتھ ستر آدمی تھے، انھوں نے کہا کہ اے موسیٰ دیکھو ہمنے گوسالہ کی اس طرح پرستش نہیں کی جیساکہ دوسرے یہودیوں نے کی ہے، اس لئے اب تم ہمکو خدا تعالیٰ کو دکھاؤ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ میں نے خود خدا تعالیٰ سے اپنے لئے بھی درخواست کی تھی۔ لیکن خدا تعالیٰ نے مجھکو بھی اس سلسلے میں کسی درخواست سے قطعاً روک دیا، بولے کہ تم جھوٹ کہتے ہو تم نے ضرور خدا کو دیکھا ہے اگر تم ہمکو نہیں دکھاؤ گے تو ہم تم پر قطعاً ایمان نہیں لانے کے۔ انکی اس گستاخی پر آسمان سے ایک صاعقہ آئی جس نے انکو جلا کر رکھدیا۔

معتزلہ کا غلط استدلال

اسی آیت سے معتزلہ نے استدلال کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کو دیکھنا ممکن نہیں نہ اس دنیا میں اور نہ عالم آخرت میں، کہتے ہیں کہ اگر خدا تعالیٰ کی رویت ممکن اور جائز ہوتی ہے تو پھر ایک جائز مطالبہ پر خدا تعالیٰ نے انکو یہ سزا کیوں دی؟ اہل سنت کیطرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ یہودیوں کو ان کے اس مطالبہ پر سزا، اس وجہ سے نہیں تھی کہ وہ رویت کا مطالبہ کر رہے تھے، بلکہ یہ سزا ان کے کفر پر تھی کیونکہ ان کا یہ کہنا کہ ہم ایمان ہی نہ لائیں گے تاوقتیکہ خدا تعالیٰ کو علانیہ نہ دیکھ لیں، قطعاً کفر ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابل غور ہے کہ انبیاء پر ایمان لانا جبکہ ان کے معجزات دیکھ لئے جائیں واجب ہو جاتا ہے۔ ان یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تمام معجزات دیکھ لئے تھے

ع خدا تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہودیوں کی یہ توبہ قتل ہی کی صورت میں کیوں تجویز ہوئی جہاں تک فقیر راقم السطور کے ذوق و وجدان کا تعلق ہے تو کچھ یوں سمجھ میں آتا ہے کہ خدا تعالیٰ جب کسی مجرم میں قطعاً صلاحیت، اصلاح کی نہیں پاتے تو پھر اسکو ختم کرنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جیساکہ ڈاکٹر ماؤف عضو کو دیکھکر جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا اثر دوسرے اچھے اعضاء پر بھی پڑے گا تو جسم سے اس عضو کو کاٹ کر علیحدہ کر دیتا ہے، لوطی نے اغلام بازی کرکے ایک ایسی خبیث فطرت کا ثبوت دیا جس کے بعد اسکی اصلاح کی کوئی توقع نہیں اس لئے سزا میں اس کا قصہ ہی ختم کر دینا تجویز ہوا۔ اس حکمت کے پیش نظر شریعت میں زانی کی سزا، دنیا سے اس کا وجود ہی ختم کرنا ٹھیرا تو بہت ممکن ہے کہ ان اسرائیلیوں میں سے صلاحیت اس طرح گم ہوگئی کہ "علیم و حکیم" نے ان کا وجود ہی ختم کرنا مناسب جانا ہو۔

لیکن اس کے باوجود پھر بھی ایمان لانے سے انکار کیا اور خدا تعالیٰ کی رویت پر ایمان کو موقوف کر دیا، یہ کتنی بڑی گستاخی اور جسارت تھی، تو عذاب اس پر آیا نہ کہ ایک ناجائز مطالبہ پر اور پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ سوال و مطالبہ کا لب و لہجہ کس درجہ بھونڈا اور معاندانہ ہے اگر اسی سوال کو مناسب انداز اور صحیح جذبے کے ساتھ پیش کرتے تو شاید خدا تعالیٰ کا فیصلہ کچھ اور ہوتا بہرحال ان آیات سے خدا تعالیٰ کی رویت نہ ہونے پر استدلال صحیح نہیں ہے ؏

فرماتے ہیں کہ اس کے بعد پھر ہم نے تم کو زندہ کیا تاکہ تم اس پر شکر ادا کرو۔ کیونکہ زندگی، موت کے بعد خدا تعالیٰ کی ایک نعمت ہے ؎

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا

اور سایہ افگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان تیہ میں) اور خزانہ غیب سے پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں کھاؤ

مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

نفیس چیزوں ہیں سے جو کہ ہم نے تمکو دی ہیں اور (اس سے) انھوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا لیکن اپنا ہی

يَظْلِمُوْنَ ۝ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا

نقصان کرتے تھے اور جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو پھر کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے

حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ

جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے اور دروازہ میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے) کہتے جانا کہ توبہ ہے

نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ

(توبہ ہے) ہم معاف کر دیں گے تمہاری خطائیں، اور ابھی ابھی مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو سو بدل ڈالا ان

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی ان سے فرمائش کی گئی تھی اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ؏ ع ۱۳ ۶ ۴

پر ایک آفت سماوی اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے

؏ یہ واقعہ اسوقت پیش آیا جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تورات کی تختیاں یہودیوں کے سامنے پیش کیں، یہودنے کہا کہ اے موسیٰ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ صحیفہ الٰہی ہے۔ ہم اسوقت تک تم پر ایمان نہ لائیں گے تاوقتیکہ خدا تعالیٰ کو علانیہ نہ دیکھ لیں حضرت موسیٰ نے بہت سمجھایا لیکن انکے نہ ماننے پر آپ ستر لوگوں کو لے کر طور پر چلے، اور وہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ اہل سنت کے خیال کے مطابق خدا تعالیٰ کو تمام ہی مومنین عالم آخرت میں دیکھیں گے اور اس دنیا میں بھی بفضل ایزدی اولیاء اللہ دیکھ سکتے ہیں

؎ یہ زندگی جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سفارش و دعا پر ہوئی تھی۔ بعث، اور موت دونوں کے معنے مرنے اور جی اٹھنے کے ہیں، اس لئے صرف غشی یا بے ہوشی ترجمہ کرنا صحیح نہ ہوگا، اور پھر من بعد موتکم یعنی "تمہارے مرنے کے بعد" اس ٹکڑے نے تو بات ہی صاف کر دی کہ یہ موت تھی صرف ان پر غشی طاری نہیں کی گئی تھی۔

انعامات کے تذکرے

ارشاد ہے کہ اور ہم نے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کر دیا اور ہم نے تمہارے اوپر من وسلویٰ اتارا کھاؤ ان پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تمکو دے رکھی ہیں اور انھوں نے زیادتی ہم پر نہیں کی بلکہ زیادتی اپنی ہی جانوں پر کرتے رہے" مطلب یہ ہے کہ بادلوں کو ان پر سایہ فگن کر دیا۔ یہ واقعہ وادی تیہ میں پیش آیا تھا جہاں دھوپ کی تپش سے بچنے کے لئے خدا تعالےٰ نے بادلوں کو کچھ اس طرح مسخر فرمایا تھا کہ یہودی جب دھوپ میں چلتے تو بادل برابر ان پر سایہ فگن رہتے۔ رات میں کچھ جلتی ہوئی لکڑیاں آسمان سے اترتیں جن کی روشنی میں وہ گرم سفر رہتے۔ اس کے ساتھ لباس نہ ان کا میلا کچیلا ہوتا اور نہ اس پر بوسیدگی کے آثار رونما ہوتے، کھانے کے لئے ترنجبین اور بٹیریں آتیں۔ ترنجبین تو صبح سے شام تک اسطرح آسمان سے گرتی رہتی جیسا کہ برف آسمان سے پڑتی ہے۔ تقریباً روزانہ ہر آدمی کے حصہ میں دو سیر کے قریب آجاتی، اور جنوبی ہوائیں چلتیں جس سے بٹیر جانور یہودیوں کے پاس آپڑتے، ہر یہودی پکڑتا اور ذبح کرتا۔ بہرحال اس طرح پاکیزہ اور عمدہ غذاؤں کا ان کے لئے کافی اہتمام کیا گیا تھا لیکن انھوں نے ان تمام نعمتوں کے باوجود کفران نعمت کیا، جس کا بر انتیجہ خود انکو ہی بھگتنا پڑا اسی لئے فرمایا کہ ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے پر زیادتی کر رہے تھے اور کفران نعمت یہ تھا کہ باوجود منع کرنے کے ان چیزوں کا ذخیرہ کرنے لگے جو کہ توکل کے قطعاً خلاف تھا۔

یہودیوں کی کجی فطرت کے کچھ اور مظاہرے

فرماتے ہیں کہ وہ وقت یاد کرو۔ جب ہم نے کہا تھا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ اور اس میں جہاں سے چاہو خوب کھاؤ پیو۔ اور دروازہ شہر میں عاجزی سے جھکے ہوئے داخل ہونا اور کہتے جانا "توبہ" ہے۔ ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور ہم نیکو کاروں کو زیادہ ہی دیتے ہیں۔

یعنی جب تیہ سے نکلے تو ان کو بیت المقدس یا اریحا میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا یہ لفظ قریہ، اجتماع کے مفہوم پر دلالت کرتا ہے کیونکہ بستی میں انسان جمع ہوتے ہیں اس لئے عربی میں اسکو قریہ کہا جاتا ہے۔ بہرحال انکو اجازت تھی کہ بستی میں جو پھل پھلواری، سبزیاں وغیرہ ہوں انکو کھا سکتے ہیں۔ اور کھانے پینے میں کوئی پابندی نہیں جتنا چاہیں کھائیں پئیں، لیکن یہ حکم ضرور تھا کہ شہر کے دروازہ یا بقول بعض مفسرین اس قبہ کے دروزہ سے جس کی جانب نماز پڑھتے تھے سجدہ کرتے ہوئے جائیں یہ سجدہ کا حکم، خدا تعالےٰ کی نعمتوں پر شکریہ اور اپنی تواضع کا مظاہرہ کرنے کے لئے تھا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی بیت المقدس میں بزمانہ حیات حضرت موسیٰ علیہ السلام داخل نہیں ہو سکے ہاں بیت المقدس کے دروازہ تک پہنچ گئے تھے شہر میں داخلہ سیدنا موسیٰؑ کی وفات کے بعد ہوا۔ اور ان یہود کو یہ بھی حکم تھا کہ حطۃ کا لفظ زبان پر داخل ہونے کے وقت میں ہو۔ حطۃ، حلبۃ کے وزن پر ہے، خبر ہے، مبتدا محذوف ہے اصل عبارت یوں ہے کہ "مسئلتنا حطۃ" یا "امرک حطۃ" ترکیب نحوی کے اعتبار اس پر اصل میں نصب ہونا چاہیئے معنے یہ ہوں گے اللہ ہمارے گناہ معاف فرما دیجئے۔ لیکن رفع اس لئے دیدیا گیا کہ حالت رفعی، ثبوت و دوام پر دلالت کرتی ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں مطلب یہ ہے کہ ہم اس شہر میں حطۃ یعنی قیام کریں گے اور یہیں ٹھیر جائیں گے۔ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حطۃ سے مراد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے اور عکرمہ کے خیال میں لا الہ الا اللہ مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

خطایا، خطیۃ کی جمع ہے گناہ کو کہتے ہیں وعدہ تھا کہ اگر تم یہ لفظ زبان سے کہو گے تو ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے بلکہ اس کلمہ کا اثر ان لوگوں کے حق میں جو نیکو کار ہیں، ثواب کی زیادتی۔ اور جو بدکار ہیں ان کے لئے مغفرت کی صورت میں نمایاں ہوگا۔

ارشاد ہے مگر ان زیادتی کرنے والوں نے جو کلمہ بتایا گیا تھا اس کے خلاف ایک اور کلمہ بدل ڈالا سو ہم نے ان

زیادتی کرنے والوں پر ایک بلا آسمان سے نازل کی اس سبب سے کہ وہ نافرمانی کرتے رہتے تھے۔ آیت میں کچھ محذوف ہے۔ پوری عبارت یوں ہے فبدل الذین ظلموا بالذی قیل لہم قولاً غیر الذی قیل لہم" عربی اسلوب کے اعتبار سے بدّل دو مفعول چاہتا ہے ان میں سے ایک کیطرف تو خود ہی متعدی ہو رہا ہے اور دوسرے مفعول کی جانب باء کے ذریعہ متعدی ہو جاتا ہے۔ یہاں جو مفعول باء کے ساتھ ہونا چاہیئے وہ موجود نہیں اور جو بغیر باء کے ہے وہ موجود ہے۔ بہرحال جو مفہوم زبانوں سے ادا کیا گیا ہے تھا اسکو چھوڑ کر دوسرے کلمات جو دوسرے مفہوم کو ظاہر کرتے کہنے لگے۔ اور اپنی اس کجفطرت کے نتیجہ میں خدا تعالے کے حکم کی مخالفت کر بیٹھے۔ بعض مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ حطۃ کے بجائے حنطۃ (گیہوں) کہنے لگے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ حطۃ کے بجائے نبیطۃ کہتے ہوئے داخل ہوئے جس کے معنی سرخ گیہوں کے آتے ہیں۔ بہرحال اس طرح خدا تعالے کے ساتھ مذاق کر رہے تھے اور جو چیز خدا سے مانگنا چاہیئے اسکو چھوڑ کر دنیا طلبی میں لگ گئے۔

جس کے نتیجہ میں ان پر عذاب آیا، الذین ظلموا کا تکرار بتاتا ہے کہ وہ کس قدر کجفطرت کے مظاہرے برابر کئے چلے جا رہے تھے جس کے نتیجہ میں ان پر عذاب آیا، گویا کہ یہ عذاب انکو بدکرداری کی پاداش تھی خدا تعالے کا ظلم نہ تھا۔ یہ عذاب طاعون کی بیماری تھی جس سے بقول بعض چودہ ہزار اور بعض کے خیال میں ستر ہزار یہودی فوراً مر گئے تھے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰؑ نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کے واسطے اس پر ہم نے (موسیٰ کو) حکم دیا کہ اپنے عصا کو فلاں پتھر پر مارو

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ

پس فوراً اس سے پھوٹ نکلے بارہ چشمے (اور بارہ ہی خاندان تھے بنی اسرائیل کے چنانچہ) معلوم کر لیا ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

کھاؤ اور (پینے کو) پیو اللہ تعالے کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو فساد اور (فتنہ) کرتے ہوئے سر زمین میں

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا

اور جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر نہ رہیں گے آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے

رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَ

دعا کریں کہ وہ ہمارے لیے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اگا کرتی ہیں ساگ (ہوا) ککڑی (ہوئی)

فُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ

گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کہ تم عوض میں لینا چاہتے ہو ادنے درجہ کی

ع‌ یہودیوں کو یہ حکم کہ سجدہ ریز بحالت تذلل داخل ہوں اسلئے تھا کہ قلب و دماغ کے ساتھ ان کے ظاہری اعضا بھی، خدا تعالے کے سامنے اپنے عجز و تذلل کا اظہار کریں اور یہاں یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ حطۃ تو عربی کا لفظ ہے اور یہودیوں کی زبان عبرانی تھی اس مفہوم کو جو حطۃ سے عربی میں ادا ہوتا ہے عبرانی میں ادا کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ ہمارے قدیم مفسرین پر بھی یہ نکتہ واضح تھا چنانچہ روح المعانی نے ان تمام اقوال کی تردید کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں سے حطۃ ہی کے لفظ کو ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تیسری چیز یہودیوں کی طاعون میں موت سے جو تعداد لکھی گئی ہے ظاہر ہے کہ وہ کوئی طے شدہ بات نہیں خود صاحب مدارک نے بھی اس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا۔

أَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ

ادنیٰ چیزوں کو ایسی چیزوں کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہیں کسی شہر میں (جاکر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ

اور جم گئی ان پر ذلت اور پستی (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر اور خود ان میں اولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ

(اور) یہ اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو

بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ ع

ناحق اور (نیز) یہ اسوجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے۔

یہودیوں کا حضرت موسیٰؑ سے ایک اور مطالبہ

ارشاد ہے کہ وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کیلئے پانی طلب کیا تو ہم نے ان سے کہا کہ تم اپنا عصا پتھر پر مارو (مارتے ہی) بارہ چشمے بہنے لگے۔ ہر ایک نے اپنا گھاٹ معلوم کر لیا۔ ترکیب عربی کے اعتبار سے اذ، محل نصب میں ہے۔ پوری عبارت یوں ہوئی کہ اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لئے پانی کی دعا کی۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب یہودی وادی تیہ میں پیاس سے جاں بلب ہو رہے تھے تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے پانی کی دعا کی تھی۔ خدا تعالےٰ نے اسی دعا پر ایک مخصوص پتھر پر عصا (لکڑی) مارنے کا حکم دیا تھا۔ الحجر پر لام عہد کا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ کسی خاص پتھر پر عصا مارنے کا حکم تھا چنانچہ اس سلسلہ میں بعض روایات بھی ہیں مثلاً یہ پتھر طور پہاڑ کا تھا جس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ لے آئے تھے جو کو تھا اور ہر کنارے سے تین چشمے پھوٹے تھے جن میں سے ایک ایک چشمہ ہر خاندان اور قبیلہ کے حصہ میں آ گیا۔ اس وقت یہودی چھ ہزار تھے اور بارہ میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے تھے اور ہو سکتا ہے کہ الحجر پر یہ لام جنس کا ہو جس کا مطلب یہ ہو گا کہ کسی بھی پتھر پر مارو بہر حال مارو پتھر پر۔ ہماری رائے میں یہ قول زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس سے خدا تعالےٰ کی قدرت کا خوب اظہار ہوتا ہے عہ

عہ یہ واقعہ ایک معجزہ کی حیثیت سے پیش آیا، معجزہ انبیاء علیہم السلام سے ثابت ہے جس کا انکار قطعاً غلط ہوگا۔ معجزہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایسی چیزیں وقوع میں آئیں جو بظاہر ہمارے فہم و عقل سے بالا اور باہر ہوں۔ اس لئے معجزات کے باب میں یہ کوشش کرانکو عقل کی خراد پر اتار کر عام انسانوں کی عقل سے قریب کیا جائے خود ایک بے عقلی ہے، غریب سرسید مرحوم نے اسی خود ساختہ اصول پر قرآن مجید کی آیات کو مسخ سے مسخ تر کر دیا، بے چارہ نے لکھا کہ "حکم حضرت موسیٰ کو یہ تھا کہ پہاڑ پر لکڑی ٹیکتے ہوئے چڑھ جائیں اور پانی کی تلاش کریں" حالانکہ یہ ترجمہ لفظی اور معنوی تحریفات کا ایک طومار ہے، معجزہ کو معجزہ کی حیثیت میں رہنے دینا ہی عقل و دانش ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین نے جن میں خصوصاً سیوطی مصنف جلالین نے لکھا ہے کہ یہ وہی پتھر تھا جو حضرت موسیٰ کے کپڑے لیکر بھاگا تھا۔ یہ بھی صحیح نہیں۔ چنانچہ علامہ رشید رضا صاحب المنار نے لکھا ہے کہ "وکون ہذا الحجر ہو الذی روی انہ ذہب بثوب موسی یوم کان یغتسل کما قال المفسر جلال لا دلیل علیہ وقصۃ الثوب لیست فی القرآن"

فانفجرت میں فار محذوف سے متعلق ہے، عبارت یوں ہے "فضرب فانفجرت" یعنی حضرت موسیٰؑ نے عصا مارا اور مارتے ہی چشمے پھوٹ نکلے، انفجار کے معنی شدت سے بہنے کے آتے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ مطلب یہ ہو کہ عصا، کو تم پتھر پر مارو گے تو اسمیں سے چشمے بہنے لگیں گے اس صورت میں یہ فار فصیحہ ہوگی جو کلام بلیغ میں استعمال ہوتی ہے، یہ چشمے بارہ تھے جو یہودیوں کے بارہ قبائل کے مطابق تھے عینا ترکیب کے اعتبار سے تمیز ہونے کی بنار پر منصوب ہے، اناس سے مراد قبائل ہیں مشرب گھاٹ کو کہتے ہیں۔

اجازت اور ایک مطالبہ

ارشاد ہے کہ ہم نے ان سے کہا کہ کھاؤ پیو اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق سے، لیکن زمین میں فسادی بن کر مت پھرو۔ اس کھانے کی اجازت من وسلوی سے ہے، اور پینے کی اجازت ان چشموں سے تعلق رکھتی تھی جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا، سے پھوٹے تھے، اور رزق اللہ سے مراد تمام ہی وہ رزق کی اقسام ہیں جن کا خالق صرف خدا تعالیٰ ہی ہیں، عیث، نہایت ہی شدید قسم کے فساد کو کہتے ہیں۔ مفسدین، ترکیب نحوی کی رو سے حال ہے جس کا مقصد تاکید ہے، اس کے بعد مطلب یہ ہوگا کہ فساد میں آگے نہ بڑھو۔

یہودیوں کا ایک اور گستاخانہ مطالبہ

ارشاد ہے کہ وہ واقعہ بھی قابل یاد ہے جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر بس نہ کریں گے سو اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعار کر ان چیزوں کی جنکو زمین اگاتی ہے ساگ ہوا، ککڑی ہوئی، گیہوں ہوا، مسور ہوئی، پیاز ہوا، موسیٰ نے کہا تو کیا جو چیز ادنی ہے تم اسے لینا چاہتے ہو اس چیز کے مقابلہ میں جو بہتر ہے، اگر لینا ہے تو کسی شہر میں اتر پڑو وہیں مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو، وادی تیہ میں جو انکو من وسلوی دیا گیا تھا یہودیوں کی یہ شکایت اسی سے تعلق رکھتی ہے، حالانکہ یہ دو کھانے تھے لیکن یہودیوں نے اسکو ایک ہی کھانا کہا، شاید یہ اس وجہ سے کھانے میں صبح و شام اور روزانہ کوئی تغیر نہ ہوتا تھا، جیسا کہ کسی دسترخوان پر متعدد کھانے ہوں لیکن روزانہ صرف وہی تیار کئے جائیں ان میں کسی تنوع سے کام نہ لیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ ان کے دسترخوان پر تو صرف ایک ہی کھانا ملتا ہے، حالانکہ کھانوں کی تعداد ایک سے کہیں زیادہ ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور بھی بات ہے وہ یہ کہ یہودی، کاشتکار تھے جن کے یہاں کاشتکاری ہوتی تھی تو اس لذیذ اور امراء و رؤساء والے کھانے پر کیسے قناعت کرتے اس لئے وہی کھانے طلب کئے جو عام طور پر کسانوں کے گھر میں چلتے ہیں یعنی ساگ، پات وغیرہ سبزی ترکاریاں جو عموماً کھائی جاتی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کسی خاص شہر میں جانے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ بلکہ آپ کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح کی چیزیں کھانے پینے کے سلسلہ میں تمکو مطلوب ہیں وہ تو کسی شہر میں مل سکتی ہیں اس لئے کسی شہر کا رخ کرو بیت المقدس اور قسترین کے درمیانی علاقہ میں جو کم از کم بارہ میل کے عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ بعض مفسرین نے اس مصر سے فرعون کا مصر بھی مراد لیا ہے یہاں عربی زبان کے اعتبار سے ایک اشکال یہ ہوتا ہے کہ اس میں دو سبب "غیر منصرف" کے موجود تھے پھر اس کو منصرف کیوں پڑھا گیا؟ یہ اس لئے کہ مصر سے اس موقع پر کوئی خاص شہر مراد نہیں بلکہ عام ہی شہر مراد ہیں اور ہوسکتا ہے کہ مصر ساکن الاوسط ہو جیسا کہ نوح اور لوط وغیرہ اور اسی وجہ سے یہ منصرف پڑھا گیا ہو حالانکہ نوح و لوط میں دو سبب موجود ہیں یعنی عجمہ اور تعریف لیکن ساکن ہونے کی وجہ سے بجائے غیر منصرف کے، منصرف انکو پڑھا جاتا ہے، بہر حال یہودیوں سے کہا گیا کہ ساگ، پات سبزیاں ترکاریاں، شہروں میں ہوتی ہیں لق و دق صحراؤں میں نہیں۔

ذلّت و مسکنت ارشاد ہے کہ ان پر (یہود پر) جمادی گئی ذلت و محتاجی، اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے یہ (سب) اس لئے ہوا کہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق قتل کر ڈالتے تھے۔ یہ (سب) اس لئے ہوا کہ وہ نافرمانی کرتے اور حد سے بڑھ جاتے تھے۔

"ضربت علیہم" کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ذلت اور محتاجی چھا گئی، جیسا کہ کوئی مکان میں ہو تو تمام ہی مکان اسکو گھیرے ہوئے ہوتا ہے ایسے ہی محتاجی اور ذلت نے ان یہود کو خوب گھیر لیا ہے، یا ذلت اور مسکنت انکو لازم ہو گئی جیسا کہ مکان پر سمنٹ کر دیا جائے اور وہ اسکو بالکل چپک جاتا ہے۔

قرآن مجید کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ یا تو یہودی فی الواقعہ ذلیل و محتاج ہیں اور یا انکی محتاجی اسوجہ سے ہے کہ وہ دل کے اعتبار سے ہمیشہ فقیر رہے۔ گو، دولت ان کے ہاتھوں میں رہی۔ اور یہ بھی کہ جزیہ کے خوف سے وہ اپنی دولت و سرمایہ داری کا اظہار نکرتے تھے۔ باؤ بغضب من اللہ، یہ اہل عرب کے ایک محاورہ سے ماخوذ ہے، محاورہ یہ ہے باء فلان بفلان، جبکہ کوئی شخص اپنی بدکرداری کیوجہ سے قتل کا مستحق ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ یہود اپنی بداعمالیوں کیوجہ سے، اللہ تعالے کے غضب کے مستحق ہو گئے۔ یہ ذلت، محتاجی اور استحقاق غضب، اسلئے تھا کہ یہود آیت اللہ کا انکار کرتے اور انبیاء کو قتل کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ یہود نے حضرت شعیا، حضرت زکریا اور حضرت یحیٰی علیہم السلام کو قتل کیا ہے۔ نبی، انباء سے ماخوذ جس کے معنی خبر دینے کے آتے ہیں۔ نبی کو نبی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ غیب کی اطلاعات عام انسانوں تک پہونچاتا ہے اور ممکن ہے کہ نباوت سے ماخوذ ہو جس کے معنی بلند اور شریف ہونے کے آتے ہیں ظاہر ہے کہ نبوت سے بڑھکر کوئی اور رفیع مقام اور شریف طبقہ دنیا میں نہیں گزرا۔

ارشاد ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا یہ سفاکانہ قتل خود تمہاری نظر میں بھی ناحق تھا۔ کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے کبھی

ع یہ آیات مفسرین کے یہاں بڑی معرکتہ الآراء بحثوں کی بنیاد بن گئیں۔ کیونکہ قرآن مجید یہودیوں کے لئے غربت اور ذلت ثابت کرتا ہے اور ادھر واقعہ یہ ہے کہ یہودیوں کا تمول انکی سرمایہ داری تمام دنیا میں مشہور ہے اور اب تو کہیں اور نہیں بلکہ قلب عرب میں انکی گورنمنٹ بھی قائم ہو چکی پھر مسکنت اور محتاجی کیسی؟ لیکن یہ اشکال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ قرآن فہمی کا ایک بڑا اصول عام طور پر نظروں سے اوجھل ہے وہ یہ کہ قرآن مجید کے بیانات صرف ایک ہی موقع کے سامنے نہ رہنا چاہئے۔ بلکہ کسی بھی تذکرہ سے متعلق تمام آیات و بیانات جمع کر کے مطلب اخذ کرنے کی کوشش کیجائے، مثلاً یہاں قرآن مجید نے یہودیوں کے متعلق۔ کہا ہے کہ ان پر ذلت اور محتاجی طاری کر دیگئی۔ لیکن ایک دوسرے موقع پر قرآن مجید نے۔ صاف کہا ہے کہ یہ ذلت اور محتاجی ان پر مسلط رہے گی الا یہ کہ خود خدا تعالے یا لوگوں کی کوئی خاص حمایت۔ انکی اس ذلت و محتاجی کے خاتمہ کا باعث ہو اور ظاہر ہے کہ آج اسرائیل گورنمنٹ، اسلام کے خلاف طاقتوں کے بل بوتہ پر قائم ہے جبکی کھلی اور حمایت، امریکہ، روس، برطانیہ اور اسی طرح کی دوسری طاقتیں کر رہی ہیں، بس یہی "حبل من الناس" ہے "جس کا قرآن صدیوں واضح پہلے اعلان کر چکا تھا اور اس کے ساتھ اسکو بھی مت بھولئے کہ یہودیوں کا تمول اور سرمایہ داری کی داستان بھی صرف ایک افسانہ ہے جبکی کوئی حقیقت نہیں چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ یہود کا تمول ضرب المثل کی حد تک شہرت پا چکا لیکن اہل تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس جس ملک میں آباد ہیں وہاں کی آبادی میں انھیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے" جلد ا صفحہ ۱۵۱۔ اور نکبت کا یہ عالم ہے کہ جرمنی، رومانیہ، اٹلی اور ہنگری کی طاقتیں یہود کو دنیا کے صفحہ ہستی سے غائب کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہیں پچھلی جنگ عظیم میں جرمنی میں یہودیوں کا جس طرح قتل عام ہوا وہ قرآن کے بیان کی ایک صداقت اور دلیل ہے۔

سه وہ روایات قطعاً غلط ہیں جن میں آتا ہے کہ یہودیوں نے ایک دن میں ستر ہزار انبیاء علیہم السلام کو تہ تیغ کیا خدا تعالے کا شکر ہے کہ اس مہمل روایت کو صاحب مدارک نے ذکر تک نہیں کیا۔

کوئی ایسا جرم سرزد نہیں ہو سکتا تھا جس کے باعث ان کو شرعاً قتل کرنا ضروری ہو۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے یہ بغیر الحق منصوب ہے کیونکہ یہ حال واقع ہو رہا ہے اس ضمیر سے جو کہ یقتلون میں موجود ہے اس ترکیب کی رو سے عبارت یوں ہوتی "یقتلونہم مبطلین" کہ انکو غلط طریقہ پر قتل کرتے ہیں۔

ارشاد ہے کہ یہود میں یہ سب کچھ خرابیاں اور مفسدے اس لئے رونما ہوئے کہ وہ طرح طرح کے گناہ کرتے، حدود اللہ سے تجاوز کرتے، آیات اللہ کا انکار کرتے اور انبیاء علیہم السلام کو تہ تیغ کرتے، بعض مفسرین کی رائے میں تجاوز سے اس موقع پر وہ تجاوز تھا جو انھوں نے "یوم السبت" کے سلسلہ میں کیا تھا (جس کی تفصیل آرہی ہے) اور ہو سکتا ہے کہ "ذلک" سے ان کے کفر اور انبیاء علیہم السلام کے قتل کیطرف اشارہ ہو کہ یہ امور، سرکشی اور نافرمانی کیوجہ سے وقوع میں آئے کیونکہ جب آدمی گناہوں میں منہمک ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں ایک سختی اور قساوت پیدا ہو جاتی ہے جس کے بعد ہر گناہ کا ارتکاب انسان کرنے لگتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ کفر اور قتل انبیاء، سب کچھ سرکشی اور نافرمانی کے ساتھ ہوا ہو

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ
بہ تحقیق بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ فرقہ صابئین (ان سب میں) جو شخص
مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ
یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات اور صفات) اور روز قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت
عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ وَإِذْ أَخَذْنَا
بھی ہے انکے پروردگار کے پاس اور وہاں جاکر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں انپر اور نہ وہ مغموم ہوں گے اور جب ہم نے تمسے
مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ
قول وقرار لیا (کہ توریت پر عمل کریں گے) اور ہم نے طور پہاڑ کو اٹھاکر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کردیا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب
وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ
ہمنے تمکو دی ہے مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو جو احکام اسمیں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بنجاؤ پھر تم اس قول وقرار کے بعد بھی (اس سے)
ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ
پھر گئے سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا تو ضرور تم (فوراً) تباہ (اور)
الْخَاسِرِينَ ۝ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي
ہلاک ہو جاتے اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنھوں نے تم میں سے (شرع) سے تجاوز کیا تھا در بارہ (اس حکم کے جو)
السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝ فَجَعَلْنَاهَا
یوم ہفتہ کے سو ہم نے انکو کہدیا کہ تم بندر ذلیل بنجاؤ پھر ہم نے اسکو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنادیا ان لوگوں کے لئے
نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ ۝
بھی جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد زمانے میں آتے رہے موجب نصیحت (بنا ما خدا سے) ڈرنے والوں کیلئے

ایک عام قانون

ارشاد ہے کہ بیشک جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور جو لوگ یہودی ہوئے ہیں اور نصاریٰ اور صابی (غرض) جو کوئی بھی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے اور نیک عمل کرے، سو ان (سب) کیلئے ان کے پروردگار کے پاس اجر ہے اور نہ کوئی اندیشہ انکے لئے ہے اور نہ وہ کوئی غم کریں گے۔" مومنین سے مراد اس موقعہ پر منافق ہیں جنھوں نے صرف ایمان کا زبان سے اعلان کیا اور دل ان کے آمادہ ایمان نہ تھے۔ ھاد یہود استعمال ہوتا ہے جس کے معنی یہودیت میں داخل ہونے کے آتے ہیں، ھائد، واحد کا صیغہ جسکی جمع ہود استعمال ہوتی ہے، نصاریٰ، نصران کی جمع ہے، جیسا کہ ندمان کی جمع ندامیٰ آتی ہے، رجل نصران و امراۃ نصرانیہ مستعمل ہیں نصیران میں یا مبالغہ کی ہے جیسا کہ احمری میں یا مبالغہ ہی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ نصاریٰ کی وجہ تسمیہ یہ بیان کیجاتی ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد (نصرت) کی تھی اس بنا پر ان کا یہ نام پڑ گیا، صابی، اس شخص کو کہتے ہیں جس نے دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کر لیا ہو۔ صابی وہ لوگ تھے جنھوں نے یہودیت و نصرانیت کو چھوڑ کر کواکب پرستی یعنی ستاروں کو پوجنا اپنا مقصد حیات قرار دے لیا تھا بعض کے خیال میں یہ لوگ زبور کو بھی پڑھتے تھے عہ بہرحال ان تمام مذکورہ بالا فرقوں میں سے کوئی بھی اگر اخلاص کے ساتھ ایمان لے آئے اور نیک زندگی اختیار کرے تو اسکو آخرت میں ایمان اور نیک عمل کا ثواب ملے گا اور انکو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی حزن"

عہ یہ آیت نہایت معرکہ کی ہے کیونکہ ان آیات میں خدا تعالیٰ کی اس حقیقت کا دانشگاف اعلان کیا ہے کہ نجات و مغفرت، کسی نبی خاندانی یا قبائلی امتیاز و فخر پر موقوف نہیں بلکہ یہ سعادت محض صحیح عقیدے اور پسندیدہ عمل پر موقوف ہے اگر یہ دونوں صحیح ہوجائیں تو پھر تمام نسبتیں بے حقیقت ہیں، آیت پر اشکال یہ ہوا ہے کہ ذکر اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا نہیں آیا صرف "ایمان باللہ" کا تذکرہ ہوا ہے حالانکہ ایمان نام ہے اللہ کی واحدانیت اور آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے اقرار کا لیکن یہ اشکال کچھ وقیع نہیں بلکہ اس کا منشاء لاعلمی اور قلت معلومات ہے، کیونکہ ایمان نام ہے اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات پر اس طرح ایمان لائے جس طرح ان پر ایمان لانے کا حق ہے جس میں کسی قسم کا شائبہ شرک نہو اس تعریف کے بعد یقیناً ایمان اپنے تمام تقاضوں کے ساتھ مفید اور معتبر ہوگا جس کا اولین اور بنیادی تقاضہ ایمان بالرسل اور بالخصوص ایمان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اگر ایمان اس قدر چاہیئے اور کامل اس موقع پر مراد نہیں لیا جائے گا تو ظاہر ہے کہ پھر ایمان کا ذکر کرنے سے فائدہ ہی کیا کیونکہ مختصر اور مجمل ایمان غیر مفید شکل میں تو ہر ہی انسان کے گوشہ ذہن و تحت الشعور میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ چنانچہ امام المفسرین رازی رح نے لکھا ہے " قد دخل فی ایمان باللہ الایمان بما اوجبہ اعنی الایمان برسلہ" ایسے ہی ایمان بالآخرت کو اگرچہ مختصر ایک عنوان کے ساتھ ذکر فرمایا لیکن یہاں بھی آخرت کی ان تفصیلات پر ایمان مراد ہے۔ جو اسلام آخرت کے متعلق پیش کرتا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر میں ہے کہ دخل فی الایمان بالیوم الاخر جمیع احکام الاخرۃ"، بہرحال یہ اشکال کہ رسالت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تذکرہ نہیں ہے صحیح نہیں۔

صابی کے متعلق مفسرین کی رائے ہے کہ یہ ایک مذہبی فرقہ تھا جو عرب کے شمال و مشرق میں شام و عراق کی سرحد پر آباد تھا یہ لوگ دین توحید اور عقیدہ رسالت کے قائل تھے اس لئے اہل کتاب تھے، بلکہ خود کو نصاریٰ بھی کہتے تھے، حضرت عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے انکو اہل کتاب میں شمار کیا ہے، سیدنا الامام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ جو خود بھی عراقی تھے اور صابیوں سے براہ راست واقفیت رکھتے تھے ان کا فتویٰ ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال اور انکی عورتوں سے نکاح جائز ہے چنانچہ قرطبی میں ہے کہ " قال ابوحنیفہ لاباس بذبائحہم ونکاح نسائہم"۔

"ایران بعہد ساسانیان" نامی کتاب میں ہے کہ "یہ فرقہ اب بھی موجود ہے اور عوام اسکو حضرت یحییٰ علیہ السلام کا متبع سمجھتے ہیں"۔

رفع طور

ارشاد ہے کہ وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے "جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور ہم نے تمہارے اوپر کوہ طور کو بلند کیا مضبوطی کے ساتھ اس (کتاب) کو پکڑ رکھو جو ہم نے تمکو دی ہے اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تاکہ تم متقی بن جاؤ" اس میثاق کا تعلق توراۃ کے احکام سے ہے۔ یعنی توراۃ میں موجود تمام احکام کے قبول کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کا وعدہ لیا گیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں ان پر طور پہاڑ کو مسلّط کر دیا گیا جس کے بعد یہودیوں نے وعدہ کیا، یہ واقعہ اس لئے پیش آیا کہ جب حضرت موسٰی علیہ السلام توریت لے کر آئے اور اس کے مضامین پر یہودیوں کو واقفیت ہوئی ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ احکام بڑے سخت ہیں تو عمل کرنے سے جی چرانے لگے اور قبول کرنے سے صاف انکار کر بیٹھے۔ اس پر اللہ تعالٰی نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا انھوں نے طور کو اکھاڑ کر یہودیوں کے سروں پر لا کھڑا کیا موسیٰ علیہ السلام یہودیوں سے بولے کہ بتاؤ اب قبول کرتے ہو یا نہیں؟ اگر انکار کرتے ہو تو یہ پہاڑ تم پر ابھی گرتا ہے جس کے نتیجہ میں تم سب ہلاک ہو جاؤ گے، یہودیوں نے ڈر کر قبول کر لیا ؏

خدا تعالٰی نے ان سے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو احکام توراۃ میں ہیں ان پر عمل کرو اور ان کو محفوظ رکھو بھلاؤ مت اگر ایسا کرو گے تو یقیناً صاحب تقویٰ ہو جاؤ گے۔

عہد شکنی

ارشاد ہے "لیکن پھر تم اس عہد سے پھر گئے، سو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اسکی رحمت نہ ہوتی تو تم ضرور تباہ ہونے والوں میں ہوتے" یہ رحمت و فضل ہی تھا کہ عذاب موخر ہو گیا اور توبہ کی توفیق عطا ہوئی ورنہ قبول کرنے کے بعد عہد شکنی اتنا بڑا جرم تھا کہ عذاب ضرور آجاتا۔"

ایک عہد شکنی اور اُس کے ہولناک نتائج

ارشاد ہے "اور تم خوب جان چکے ان لوگوں کو جنھوں نے تم میں سے سبت کے بارہ میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔ پھر ہم نے اسے موجب عبرت بنا دیا اس زمانے کے اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے اور ایک موجب نصیحت بنا دیا خوف خدا رکھنے والوں کے لئے"۔ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے دور میں پیش آیا۔ تفصیلات اسکی یہ ہیں کہ خدا تعالٰی نے خود یہود کی خواہش پر یوم السبت (ہفتہ کا دن) کو یہودیوں کے لئے عبادت کے لئے خاص فرما دیا تھا اور حکم تھا اس دن سوائے عبادت کے اور کچھ نہ کریں۔ پھر خدا تعالٰی نے آزمانے کے لئے ہفتہ والے دن تمام مچھلیاں دریا میں بھیجنا شروع کر دیں۔ یہاں تک کہ ہر مچھلی اس دن پانی سے اپنی گردن نکالتی اور جیسے ہی

؏ - طور اگرچہ عربی زبان میں ہر پہاڑ کو کہتے ہیں لیکن قرآن مجید میں جب طور کا ذکر آتا ہے تو اس سے وادی سینا میں واقع پہاڑ مراد ہوتا ہے۔ ہمارے دور کے جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور سے مراد وادی سینا کے بہت سے پہاڑی سلسلے ہیں۔ لیکن ان بہت سی چوٹیوں میں سے ظاہر ہے کہ طور کسی خاص چوٹی کا نام ہوگا جیسا کہ ہمالیہ کی متعدد چوٹیوں میں سے ایک کا نام "ایورسٹ" ہے رفع طور کی کچھ کیفیت یہودیوں کی مذہبی کتابوں میں بھی ملتی ہے، مثلاً تالمود جو کہ توراۃ کی سب سے زیادہ مستند اور معروف شرح ہے اس میں لکھا ہے کہ "حق تبارک و تعالٰی نے ان کے اوپر کوہ سینا کو الٹ دیا جیسا کہ کوئی بڑا ظرف الٹ دیا جاتا ہے اور کہا کہ اگر تم توراۃ کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن ہو کر رہ جاؤ گے"۔ تقریباً اسی طرح کی روایات ہمارے قدیم مفسرین نے بھی نقل کی ہیں واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔ اشکال اس پر یہ بھی کیا گیا کہ یہ تو زبردستی ایمان لانے کا مطالبہ ہوا یہ کیسے صحیح ہے؟ جواب متعدد دیئے گئے جن میں سے ایک جواب یہ بھی ہے کہ "زبردستی ایمان" کی ممانعت امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہے ورنہ دیگر امم میں اس کی کوئی ممانعت نہ تھی۔

ہفتہ کا دن ختم ہوتا تو مچھلیاں منتشر ہو جاتیں۔ یہودیوں نے اسکی ایک تدبیر سوچی اور وہ یہ کہ انھوں نے دریا کے قریب چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود دیئے اور دریا کا پانی نالیوں کے ذریعہ ان گڑھوں میں لا ڈالا۔ اس طرح مچھلیاں ہفتہ کے دن نالیوں میں بہتی ہوئی ان گڑھوں میں پہنچ جاتیں یہود جب دیکھتے کہ مچھلیاں گڑھوں میں آگئیں تو پھر نالیوں کے منہ بند کر دیتے تاکہ مچھلیاں واپس دریا میں نہ چلی جائیں، اب اتوار کا دن آتا تو شکار کرتے اور اپنی اس تدبیر پر خوب خوش ہوتے یہی ان کا تجاوز تھا۔ اس پر خدا تعالیٰ نے تکوینی طور پر ان کے بندر ہونے کا حکم صادر فرما دیا بندر بھی ہو گئے اور ساتھ ہی ذلیل و خوار بھی ان کو دیکھکر سب عبرت حاصل کرتے، بلکہ رہتی دنیا تک ان کا واقعہ عبرت و نصیحت کا ذریعہ بنا رہے گا عہ

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو

بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ

وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا آپ ہمکو مسخرا بناتے ہیں موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں

مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۭ

کا سا کام کروں وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ

آپ نے فرمایا کہ وہ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بالکل بوڑھا ہو نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو دونوں عمروں کے وسط میں

بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ

سو اب زیادہ حجت مت کیجئو (بلکہ) کر ڈالو جو کچھ تمکو حکم ملا ہے کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کر دیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے

يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاۗءُ ۙ

ہم سے یہ (بھی) بیان کر دیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہے

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا

جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین کو فرحت بخش ہو کہنے لگے (اب کی بار اور) اور ہماری خاطر اپنے رب سے درخواست کر دیجئے کہ ہم سے

عہ یہ واقعہ بقول بعض مفسرین حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایلہ نامی شہر میں پیش آیا۔ یہودیوں کے یہاں ہفتہ کے دن کی سی طرح عظمت تھی جس طرح مسلمانوں میں جمعہ کی اور عیسائیوں میں اتوار کی، تا آنکہ ہر طرح کے مشاغل اسدن ممنوع تھے۔ لیکن یہودیوں نے اپنے خبث باطن کیوجہ سے شکار کی ایک تدبیر نکال لی اور اس طرح خدا تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ہو گئے۔ بندر کی شکل میں انکو حقیقۃً منتقل کر دیا گیا تھا، اور خدا تعالیٰ کی قدرت سے کوئی بعید بات بھی نہیں۔ لیکن یہ بالکل غلط مشہور ہے کہ موجودہ بندر انھیں کی نسل سے ہیں۔ بعض قدیم مفسرین یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ مسخ شکل و صورت کے اعتبار سے نہیں بلکہ فطرت کے اعتبار سے ہوا تھا یعنی وہ اپنے مزاج اور خصوصیات کے اعتبار سے بندر کر دیئے گئے تھے اگرچہ صورتاً انسان ہی تھے۔ چنانچہ ابن جریر نے مجاہد کا یہی قول نقل کیا ہے۔ لیکن علماء نے اس قول کو زیادہ صحیح نہیں سمجھا وہ کہتے ہیں کہ صورت و ظاہر کے اعتبار سے بھی بندر کر دیئے گئے تھے۔

مَا هِيَ لا اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ط وَ اِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ

کہ اس کے اوصاف کیا ہوں کیونکہ ہمکو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ ہے اور ہم ضرور انشاء اللہ تعالیٰ (ابکی بار) ٹھیک

لَمُهْتَدُوْنَ ○ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ

سمجھ جاویں گے موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو جس سے

تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ج مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ط

زمین جوتی جاوے اور نہ اس سے زراعت کی آب پاشی کی جاوے (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو اور اس میں

ع قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ط فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ○ ٤

کوئی داغ نہ ہو (یہ سنکر) کہنے لگے کہ اب آپ نے پوری بات فرمائی۔ پھر اسکو ذبح کیا اور (انکی حجتوں سے ظاہرا) معلوم ہوتے نہ تھے

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ط وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ

اور جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کر دیا پھر ایک دوسرے پر اسکو ڈالنے لگے اللہ تعالیٰ کو اس امر کا اظہار

مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ج ○ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ط كَذٰلِكَ

کرنا منظور تھا جس کو تم مخفی رکھنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے حکم دیا کہ اسکو اسکے کوئی ٹکڑے سے چھوا دو اسی طرح حق تعالیٰ

يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

(قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنے نظائر قدرت تم کو دکھلاتے ہیں اسی توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو

یہود کی معاندانہ روش ایک حیرت انگیز واقعہ، وحی اور اسکو تسلیم کرنے سے اعراض

ارشاد ہے کہ اور وہ وقت یاد کرو، جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ وہ بولے آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں کیا؟ موسیٰؑ نے کہا خدا مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں ہو جاؤں۔ وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی ہو؟ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بن بیائی (بلکہ) دونوں عمروں کے درمیان ہو۔ سو اب کر ڈالو جو کچھ تمہیں حکم ملا ہے، وہ بولے ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہے؟ کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو، دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو۔ وہ بولے اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتلائے کہ وہ (اور) کیسی ہو؟ اس لئے کہ گائے میں ہمیں اشتباہ پڑ گیا ہے، اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے کہا کہ وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین کو جوتتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو، اس میں کوئی داغ دھبہ نہ ہو، وہ بولے اب آپ ٹھیک پتہ لائے پھر انھوں نے اس کو ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہ ہوتے تھے"۔

ان آیات کا عطف، نعمتی پر ہو رہا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ بھی یاد کرو اور وہ بھی یاد کرو گویا کہ تمام سابقہ نعمتوں کے ساتھ جو فرعون کے ظلم سے نجات کی صورت میں دریا سے بسلامت عبور ہونے کی شکل میں اور پانی وغیرہ کی نعمت

ان کے ساتھ یہ واقعہ بھی ایک نعمت ہے اور اسی انداز سے اسکو سنو، یاد کرو۔ مفسرین کے قول کے مطابق، قصّہ کا ابتدائی حصّہ بالکل آخر میں آرہا ہے جہاں اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ" واذ قتلتم نفسًا فادّارأتم الخ یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ بنو اسرائیل میں ایک بہت مالدار شخص تھا جس کا نام عامیل تھا اس کے چچا کی اولاد نے اس کو قتل کردیا تاکہ اس کے متروکہ اموال وجائداد کا مالک بن جائیں۔

لاش شہر کے دروازہ پر لیجاکر ڈالدی۔ اور دیدہ دلیری یہ کہ پھر خونبہا کا مطالبہ شد ومد سے کھڑا کردیا۔ ادھر قاتل کیونکہ متعین نہیں تھا تو عجیب ہنگامہ سا ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے رجوع کیا تو انھوں نے خدا تعالےٰ کے ارشاد پر انکو بتایا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کا کچھ حصہ مقتول کے جسم سے لگاؤ، لگاتے ہی یہ زندہ ہوکر اپنے قاتل کو خود ہی متعین کردیگا اس پر بجائے اس کے کہ یہود خدا تعالےٰ کے حکم کی تعمیل کرتے، لگے حضرت موسیٰؑ سے الجھنے اور کہنے لگے آپ بھی مذاق کرتے ہیں بھلا کہاں گائے کا گوشت اور کہاں مقتول کا زندہ ہونا دونوں باتوں میں کوئی تک بھی ہے! ہزو کے معنی نفس کو مذاق کے طور پر حرکت دینا آتے ہیں، اور العیاذ واللیاذ دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ یعنی پناہ طلب کرنا۔ حضرت موسیٰؑ نے انکو بتایا کہ وحی کے معاملہ میں مذاق کرنا جہالت ہے اور اس ارشاد میں لطیف طنز یہود پر یہ تھا کہ تم میرے متعلق یہ خیال کرکے کہ میں مذاق کررہا ہوں گویا کہ اپنی جہالت کا ثبوت دے رہے ہو۔ یہودیوں نے اب اس گائے کے متعلق تحقیق وتفتیش شروع کردی کیونکہ اتنا تو معلوم ہی ہوچکا تھا کہ گائے کاٹنا ہے لیکن وہ ہو کیسی! سوال اس سلسلہ میں تھا۔ عربی اسلوب کے اعتبار سے ... ، جنس کا سوال کرنے کے لئے آتا ہے، اور کیف اوصاف سے متعلق سوالات کا فائدہ دیتا ہے لیکن گاہے، ما، کیف کیلئے بھی استعمال کرلیتے ہیں، سوال کا منشاء یہ بھی تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے کہ ذبح شدہ گائے کی بوٹی سے، ایک مرا ہوا آدمی اٹھ بیٹھے۔ اس لئے ایسی حیرت انگیز کام انجام دینے والی گائے کے بارے میں انھوں نے پوچھ تاچھ شروع کردی۔

فارض کے معنی بوڑھی کے آتے ہیں۔ لغت عربی کی رو سے فرض کے معنی کاٹنے اور قطع کرنے کے آتے ہیں۔ بوڑھی گائے کو فارض اس لئے کہتے ہیں کہ اس نے اپنے دانت توڑ لئے اور آخر عمر کو پہنچ گئی۔ ترکیب نحوی کے اعتبار سے، ما مبتدا ہے اور ہی، خبر، بکر، نر، حیوان کو کہتے ہیں، عوان کے معنی پٹھا، درمیانی عمر والا یعنی جو نہ بوڑھی ہو اور نہ جوان، ساتھ ہی یہود کو توجہ دلائی کہ زیادہ پوچھ گچھ نہ کرو بلکہ جس کا حکم دیا گیا ہے اسکی تعمیل کرو۔ لیکن وہ پھر بھی بولے کہ اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیئے، اس پر خدا تعالےٰ نے رنگ بھی بیان فرمادیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جوتا زرد رنگ کا پہننا چاہیئے اس سے انسان غموں سے محفوظ رہے گا۔ فرماتے تھے یہ اس لئے کہ خدا تعالےٰ نے زرد رنگ کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ دیکھنے والے اسکو دیکھکر سرور حاصل کریں اس مفید اور کارآمد تفصیل کے باوجود یہود نے ادھیڑ بن شروع کردی۔ مزید سوالات اس سلسلہ میں شروع ہوگئے۔ مثلاً یہی کہ موسیٰ ابھی کچھ اور بتاؤ۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہود کسی کنج وکاؤ میں نہ پڑتے تو جیسی کیسی بھی ذبح کرتے بہرحال کام چل جاتا۔

لیکن یہود نے اس معاملہ میں بعض غیر ضروری پابندیاں خود پر عائد کیں تو خدا تعالےٰ نے بھی انکو پابند کردیا۔ اسلئے کنج وکاؤ بہتر نہیں۔ بہرحال بولے کہ وہ گائے جس کے متعلق تم کہتے ہو کہ جوان ہونی چاہیئے اور زرد رنگ کی، ایسی گائیں تو ہزاروں ہیں اسلئے انتخاب کریں تو کس طرح اور اے موسیٰ ہم کو یقین ہے کہ تمہارے خوب کھول کر بیان کرنے سے اس سلسلہ میں صحیح قدم اٹھانے کے ہم قابل ہوجائیں گے اور ہوسکتا ہے کہ مطلب یہ ہو کہ قاتل کی صحیح یقین ہمکو خدا نے چاہا تو حاصل ہوجائے گی۔

انّ اور اس کی خبر کے درمیان" انشاء اللہ" جملہ معترضہ کے طور پر آگیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہود

"انشاء اللہ" نہ کہتے تو قیامت تک سوالات ہی میں الجھے رہتے اور معاملہ کسی طرح طے نہ ہوتا اس پر حضرت موسیٰؑ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ گائے ایسی ہو جو کہ زمین کو جوتنے کے لئے استعمال نہ کیجاتی ہو، اور نہ آب پاشی کے لئے۔ ترکیب نحوی کے اعتبار پہلا "لا" نافیہ اور دوسرا "لا" تاکید کے لئے ہے جو پہلے "لا" سے حاصل شدہ نفی کی تاکید کرتا ہے اس میں کوئی عیب بھی نہ ہو اور زرد رنگ صرف زرد ہی ہو کسی اور رنگ کا کوئی دھبہ بھی نہ ہونا چاہیئے تا آنکہ سینگ اور کھر بھی زرد ہی ہوں۔

شِیَتَہ، اصل میں مصدر ہی استعمال ہوتا ہے "وَشَاہ" وَشْیاً، وشیۃً، جب کہ ایک ہی رنگ دوسرے رنگ کے ساتھ مل جائے، بولے، کہ اے موسیٰ بس اب بات صاف ہوگئی اور وہ تفصیلات جو اس سلسلہ میں مطلوب تھیں کامل طور پر سامنے آگئیں، اس کے بعد یہود نے ایک ایسی گائے حاصل کرلی جس میں یہ تمام اوصاف تھے باوجودیکہ اس کی قیمت بہت زیادہ تھی بار سوائی کا خطرہ کہ قاتل معلوم ہو جائے گا تو کیسی رسوائی ہو گی ان خطرات سے ذبح نکرتے تھے تاہم انکو ذبح کرنا ہوا۔

اس سلسلہ میں ایک یہ واقعہ بھی بہت مشہور کہ یہود میں ایک بوڑھا آدمی تھا۔ بے چارہ بڑا ہی نیک اس کے پاس ایک گائے تھی یہ اس گائے کو لے کر جنگل پہونچا اور بولا کہ اے اللہ میں اسکو آپ کے سپرد کرتا ہوں جب تک کہ میرا لڑکا بڑا نہ ہو۔

یہ لڑکا بھی اپنے والدین کا بڑا ہی اطاعت گزار اور فرمانبردار تھا۔ بہرحال یہ گائے وہیں جنگل میں رہتی چرتی، تاآنکہ جوان ہوگئی، کہتے ہیں کہ یہ سب سے اچھی گائے تھی اور وہ تمام اوصاف اس میں موجود تھے جو خدا تعالےٰ نے یہودیوں کو ذبح کیجانے والی گائے کے بتلاتے تھے۔ یہودیوں نے، اس لڑکے سے اور اس کی ماں سے اس گائے کا سودا کیا اور بڑی نقدی دیکر اس کو خرید لیا، حالانکہ اس وقت گائے کی قیمت زیادہ نہیں بلکہ کم ہی تھی۔ یعنی اچھی خاصی گائے تین چار اشرفیوں میں آجاتی۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس گائے کی تلاش میں جو یہودیوں کو مطلوب تھی چالیس سال یہود سرگرداں رہے عہ

اصل قصہ ارشاد ہے کہ وہ وقت یاد کرو جب کہ تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا پھر تم آپس میں جھگڑنے لگے، اور اللہ وہ ظاہر کر دینا چاہتے تھے جس کو تم چھپا رہے تھے، تو ہم نے کہا کہ اس میت پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا مارو۔ یونہی اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔"

آیات میں اگرچہ تمام ہی یہود کو خطاب کیا گیا ہے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ قتل کرنے والے تو چند ہی ہوں گے۔ اس عام خطاب کی وجہ یہ ہے کہ چھپانے کی کوشش ان چند کی طرف سے ہوئی تھی لیکن اس میں سب ہی یہود کر رہے تھے۔ فَادّٰرَءْتُم تھا اس میں تخفیف کے ارادہ سے تار کو دال کرلیا تاکہ یہ اس دال کے جنس سے ہو جائے جو فا، کلمہ کی جگہ واقع ہے اس طرح ادغام ممکن ہو سکے گا۔ پھر دال کو ساکن بھی کرنا پڑا کیونکہ ادغام کے لئے اول کا ساکن ہونا شرط ہے، ہمزہ وصلی کا اضافہ ابتداء بالساکن کی دشواریوں سے بچنے کے لئے ہے ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد یہ فادّارءتم ہوا جس کے معنی ایک دوسرے پر ڈالنے، دفع کرنے کے آتے ہیں کیونکہ وہ قتل کو ایک دوسرے کے سر چپکا رہے تھے۔ اس لئے

عہ یہ سب اسرائیلیات ہیں جن پر کوئی اعتبار و اعتماد نہیں کرسکتا۔

لفظ اختیار کا ارادہ فرمایا حالانکہ ان کی یہ کوشش بے کار تھی کیونکہ حق تعالیٰ نے اس قتل کے اصل اسباب اور قاتل کی نشاندہی کا ارادہ فرما لیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے ارادہ کے بعد کس کی کوشش کامیاب ہو سکتی ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارادہ کو پورا کرنے کے لئے ان سے فرمایا کہ ذبح کر گائے کا کچھ حصہ اس مردہ نعش سے لگاؤ، اضربوہ میں ضمیر، نفس کی طرف راجع ہے۔ اور ضمیر مذکر کی استعمال کی ہے حالانکہ "نفس" عربی میں مونث استعمال ہوتا ہے یہ اس لئے کہ نفس سے مراد، مذکر یعنی وہی یہودی مقتول تھا۔ اور ہو سکتا ہے کہ قتیل مراد ہو۔ ظاہر ہے کہ قتیل مذکر ہی کا صیغہ ہے اس لئے ضمیر مذکر استعمال کرنا ہی بہتر تھا۔ کہتے ہیں کہ جس حصہ کو لگانے کے لئے حکم تھا وہ اس گائے کی زبان تھی اور بعض کہتے ہیں کہ داہنی ران، بعض کا خیال ہے کہ کمر کی ہڈی لگانے کے لئے کہا گیا تھا۔ع

اس کے بعد کلام کا کچھ حصہ محذوف ہے بات مکمل اس طرح بنے گی کہ انھوں نے گوشت کو اس مقتول کے لگایا جس کے بعد وہ زندہ ہو گیا کیونکہ یہ مفہوم حاصل ہو رہا تھا اس لئے حذف کر دیا گیا۔

احیاء موتیٰ

ارشاد ہے کہ اس طرح خدا تعالیٰ مردوں کو زندہ کرے گا، اور وہ تمکو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو، مفسرین لکھتے ہیں کہ جب اس مقتول یہودی کے جسم سے گوشت کا وہ ٹکڑا لگایا گیا تو وہ اللہ کے حکم وقدرت سے اٹھکر بیٹھ گیا اور بولا کہ میرے قاتل چچا کے فلاں فلاں لڑکے ہیں یہ کہہ کر پھر زمین پر مردہ کیطرح گر گیا۔۔۔۔ اس نے اپنے قاتلوں میں صرف دو ہی کو بتایا تھا اس لئے وہ دونوں پکڑ لئے گئے اور قتل کر دیئے گئے اور اس کے بعد شریعت موسوی کا یہ مستقل قانون بن گیا کہ قاتل کو وارث کی حیثیت سے مقتول کے مال میں شریک نہیں کیا جائیگا۔

اب رہ جاتا ہے یہ ارشاد کہ "اللہ تعالیٰ یوں ہی مردوں کو زندہ کرے گا" تو بہت ممکن ہے کہ اس کے مخاطب وہ لوگ ہوں جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے، اور موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے منکر تھے اور ہو سکتا ہے کہ خطاب ان حاضرین سے ہو جو اسرائیل کے مقتول کو اپنی آنکھوں سے زندہ ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے، اس صورت میں گویا کہ اس ارشاد کا حاصل یہ ہوگا کہ "ہم نے اس وقت موجود لوگوں سے کہا کہ دیکھ لو یوں ہی خدا تعالیٰ تمکو قیامت میں زندہ کرے گا اور تمکو اب اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تو کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی دینے پر بخوبی قادر ہے، چنانچہ اپنی اسی قدرت کو دکھانے کے لئے انھوں نے یہ واقعہ تمکو دکھایا جس سے تمکو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہر چیز پر خوب قادر ہے۔ اگر تمکو اسکی بے پناہ قدرتوں کا یقین ہو گیا تو پھر تم وہ کام کروگے جو عقل کے مطابق ہو یعنی تم سمجھوگے کہ جو ذات مقتدر ایک آدمی کے زندہ کرنے پر قادر ہے وہ سب کو زندہ کر سکتی ہے کیونکہ اس ایک کیساتھ کوئی خصوصیت تو تھی نہیں کہ تم کہدو کہ بس وہی زندہ ہو گیا دوسروں کو (العیاذ باللہ) خدا تعالیٰ زندہ نہیں کر سکتا۔

ایک اہم نکتہ

اس پورے واقعہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس مردہ کو زندہ کرنے کے لئے گائے کا گوشت کیوں استعمال کیا؟ حالانکہ خدا تعالیٰ یقیناً اس پر قادر تھے، کہ اسکو یوں ہی زندہ کرتے اور کسی چیز کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس سلسلہ میں قصہ کے ظاہری سطح پر غور کرنے کے بعد، گوشت استعمال کرانے کی حکمت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ خدا تعالیٰ بندوں کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ بندے طلب پر کوئی نیک کام مقدم کریں۔ یعنی پہلے کوئی نیک کام کریں اور اس کے بعد خدا تعالیٰ سے طلب کریں اور نیز یہ بھی بتانا تھا کہ معاملات میں

ع‍ہ سب اسرائیلیات ہیں قرآن کو سمجھنے کے لئے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔

شدّت نہ اختیار کیا کریں، بلکہ کچھ پوچھے گچھے بغیر فوراً خدا تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں کمربستہ ہو جائیں اور نہ سوالات کا سلسلہ ۔۔ انسانوں کے لئے مفید! آپ نے بھی دیکھ لیا کہ یہود خواہ مخواہ سوالات کرتے رہے کہ گائے کیسی ہونی چاہیئے اس کا رنگ کیسا ہو وغیرہ ۔ جس کے نتیجہ میں خدا تعالےٰ نے پابندیاں عائد کر کے ان کے لئے راہ تنگ کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روش بالکل ناپسندیدہ ہے۔

ایک سوال یہ بھی ہے کہ گائے ہی کے ذبح کا کیوں حکم دیا گیا یہ مقصد کسی اور جانور سے بھی پورا ہو سکتا تھا؟ اس کا جواب مفسرین دیتے ہیں کہ گائے یہودیوں کے مذہب میں، قربانی کے جانوروں کے سلسلہ کا سب سے بہترین جانور سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے حکم دیا اور یہ بھی کہا گیا کہ کیونکہ یہودیوں نے "بچھڑے" کی پرستش کی تھی اس لئے خدا تعالےٰ نے چاہا کہ ان کے معبود کو انھیں کے سامنے ذلیل کریں تاکہ اس معبود باطل کی بے حقیقتی ان پر آشکارا ہو جائے۔

اشکال اور اس کا حل

اس واقعہ کا ایک اور پہلو بھی غور طلب ہے وہ یہ کہ واقعہ کی ترتیب اسطرح ہونی چاہیئے تھی کہ پہلے واقعہ اور اس کے بعد، یہودیوں کی خواہ مخواہ کی موشگافیاں، اور ان کی سازش سے نقاب کشائی، لیکن خدا تعالےٰ نے یہ ترتیب بدل دی، واقعہ کو بعد میں "واذ قتلتم الخ" سے ذکر فرمایا اور یہود کی بے عنوانی، پہلے ارشاد فرمائی ۔ یہ اس لئے تاکہ یہود کی بدفطرتی اور انکی کجی فطرت سامنے آجائے کہ وہ خدا تعالےٰ کے صاف احکام میں کس طرح کی موشگافیاں کرتے ہیں گویا کہ انکو انکی اس روش پر تنبیہ کرنا تھی اسطرح یہ دو مستقل اور علیحدہ قصے اس مناسبت سے کہ دونوں میں یہود کو تنبیہ ہے ایک ہی واقعہ نظر آتے ہیں۔ پہلے قصہ میں انکو ان کے لغو مذاق پر تنبیہ اور اس پر انتباہ کہ وہ فوراً خدا تعالےٰ کے حکم کی تعمیل میں کیوں نہیں لگ جاتے اور دوسرے واقعہ میں انکو اس بات پر مطعون کیا گیا کہ انھوں نے ایک معصوم جان کو کیوں ضائع کیا، اور پھر اس کے مناسب احکام دیئے گئے ۔ بہر حال اگر یہ ایک ہی قصہ بنا کر پیش کیا جاتا تو دوسرے واقعہ سے، حاصل شدہ ہدایات، میسر نہ آتیں۔

نکتہ قرآن حکیم کی بلاغت کی کہاں تک داد دیجیے، کیا یہ اہم نکتہ پیش نظر رہا کہ دوسرے واقعہ کو شروع کرنے کے وقت ایک مستقل واقعہ کی حیثیت سے اسکو شروع فرمایا، اور پہلے واقعہ سے اس کا تعلق دکھانے کے لئے بقرہ کا نام نہیں لیا بلکہ ضمیر اسکی طرف راجع فرمادی جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ارشاد فرمایا "اضربوہ" یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تاکہ معلوم ہو کہ تنبیہ کے مقصد کو سامنے رکھکر اگر دیکھا جائے تو یہ علیحدہ علیحدہ قصے ہیں اور ویسے ایک ہی مسلسل واقعہ گائے کا ہے جب ہی تو صرف ضمیر راجع کر کے چھوڑ دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس واقعہ سے یہ بھی سمجھانا ہے کہ جو شخص اپنے دل کو مشاہدات سے زندہ رکھنا چاہتا ہے اسکو چاہیئے کہ وہ مجاہدہ کر کے نفس کشی کرے۔